باسمہ تعالےٰ

ہندو کیا ہے — اور کیا کرنا چاہتا ہے؟

مستند حقائق اور واقعات پر مبنی تجزیہ جو
حقیقت کشا بھی ہے اور عبرت آموز بھی

بتقریب یوم آزادی ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء شائع کیا گیا

پرویز

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

ہندو کیا ہے ــــــ اور کیا کرنا چاہتا ہے؟

پرویز

روزنامہ نوائے وقت بابت ۲ جولائی ۱۹۸۰ء میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی:-

گزشتہ برس بھارت میں سابقہ برسوں کی نسبت فرقہ وارانہ صورت حال سنگین ترین تھی۔ بھارت کی وزارت داخلہ نے ۱۹۷۹ء کے بارے میں جو رپورٹ جاری کی ہے اس میں بتایا گیا کہ ۱۹۷۹ء میں (۳۰۴) واقعات ہوئے جن میں (۲۶۱) افراد ہلاک ہوگئے۔ رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۶ء میں (۱۶۹) فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جبکہ ۱۹۷۷ء میں یہ تعداد (۱۸۸) اور ۱۹۷۸ء میں (۲۳۰) ہوگئی۔ ۱۹۷۶ء میں (۱۳۰) افراد ہلاک اور (۹۴) زخمی ہوئے جبکہ ۱۹۷۷ء میں (۳۶) افراد ہلاک اور (۹۴۰) زخمی ہوئے۔ اور ۱۹۷۸ء میں (۱۱۰) ہلاک اور (۱۸۵۳) زخمی ہو گئے۔ وزارت داخلہ میں فرقہ وارانہ خیرسگالی کے بارے میں مستقل طور پر معلومات جمع کرنے کے لئے ایک سیل قائم کر دیا گیا ہے۔

اس سے تھوڑا عرصہ پہلے وہاں، جمشید پور میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی۔ پھر علی گڑھ میں جس طرح انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کیا گیا۔ اور اواخر جولائی ۱۹۸۰ء میں سرینگر میں ان کی بے پناہ ہلاکت کی جو خبریں نشر ہوتی رہیں ان سے مسلمانانِ پاکستان کا حساس طبقہ تلملا اٹھا اور ہمیں مختلف گوشوں سے یہ کہا گیا کہ ہم اس موضوع پر تفصیل سے لکھیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بھارت کی طرف سے اس قسم کی خوں ریزیوں اور ہلاکت خیزیوں کو جو "فرقہ وارانہ فسادات" کہہ کر پکارا جاتا ہے، تو یہ حقیقت پر پردہ پوشی کی سعیٔ ناکام ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات نہیں بلکہ وہاں کے حکمران طبقہ کی طرف سے خود اپنی رعایا کے خلاف ظلم اور زیادتی کے واقعات ہیں۔ یہ نقطہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

ہندوؤں نے اپنے ہاں جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں جمہوری نظام ہے ہی نہیں۔ جمہوریت ان کے مذہب کے خلاف - ان کی روایات کے خلاف اور ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہندو دھرم میں انسانوں کی تقسیم ورنوں (ذاتوں) کی رو سے ہوتی ہے، اور یہ ورن خود برہما کے متعین کردہ ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ ان ورنوں کے مطابق تعلیم و تدریس - قانون سازی اور عدلیہ کے مناصب برہمنوں کے سپرد ہوتے ہیں؛ اور انتظامیہ (اور دفاعیہ) کشتریوں کی تحویل میں۔ باقی دو ورن (ویش اور شودر، جن کی ان کے ہاں اکثریت ہے) پہلے دو ورنوں کی خدمت گزاری کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اور شودروں کو انسانیت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے واضح ہے کہ ان کے ہاں خود اپنی قوم کے اندر بھی جمہوری نظام کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک ملکی جمہوریت کا تعلق ہے، وہاں

ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں، اور ان کی یہ اقلیت (MINORITY) کسی صورت میں بھی اکثریت (MAJORITY) کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہاں ہندو مستقلاً حاکم اور مسلمان مستقلاً ان کے محکوم رہتے ہیں اور محکوم رہیں گے۔ ہندو جو تقسیم ملک کے اس قدر مخالف تھے تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ان کی گرفت سے نکل جائے۔ پاکستانی مسلمان تو (بحمدہٖ) ان کی گرفت سے نکل گئے لیکن وہاں کے مسلمان ان کے آہنی شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جنہیں "فرقہ وارانہ فسادات" کہہ کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے وہ درحقیقت وہاں کی اکثریت (ہندو حکمران طبقہ) کے، وہاں کی اقلیت (محکوم مسلمانوں) پر مظالم ہیں۔ اور یہ کوئی ہنگامی یا حالیہ واقعات نہیں۔ ان کا سلسلہ تو تقسیم ہند کے فوری بعد سے شروع ہو گیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ کسی قوم کی ذہنیت کی ساخت، اور اس کی سیرت و اخلاق کی تشکیل میں اس کے مذہبی عقائد کا بڑا گہرا دخل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ قوم بظاہر اپنے مذہب کو تیاگ بھی دے لیکن اس کے پیدا کردہ اثرات اس کے تحت الشعور میں نسل در نسل تک پیوست رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہندو مذہب کا بنیادی عقیدہ ورنوں کی تفریق و تقسیم ہے۔ اس سے ان میں خود اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ جب ان کی خود اپنے لوگوں کے خلاف نفرت کا یہ عالم ہے تو مسلمانوں کے خلاف، جنہیں وہ انسان نہیں بلکہ ملیچھ (ملیکش یعنی وحشی درندے) سمجھتے ہیں، ان کی نفرت اور عناد کی کیا کیفیت ہوتی۔ ظاہر ہے!

ہم اپنی قوم کے متعلق شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ ان میں دنیا بھر کی برائیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ان کے اخلاق بگڑ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، اسلام کی تعلیم کے جو اثرات ان کے تحت الشعور میں جاگزیں ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ اس تیس سال کے عرصہ میں (جبکہ ہندوستان میں مسلم کش فسادات کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے) پاکستان میں کسی ہندو کے خلاف محض اس کے ہندو ہونے کی بنا پر انگلی تک نہیں اٹھائی گئی۔ وہ یہاں نہایت امن و سکون اور مرفہ الحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذہنیتوں کے فرق کو سمجھنے کے لئے ہم اس مقام پر دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہندوستان کی فوجوں نے شکر گڑھ کے علاقہ میں جو قیامت ڈھائی تھی اس کی ایک خبر روزنامہ امروز کی اشاعت بابت ۲۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں ان الفاظ میں شائع ہوئی تھی۔

> ندعی یونیورسٹی کے تھرڈ ایئر کے ایک طالب علم اعجاز احمد نے نمائندہ امروز کو نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بھارتیوں کی زیادتی کی داستان سناتے ہوئے کہا کہ ہمیں ۱۷ دسمبر کو صبح ۹ بجے موضع بھابھڑہ سے ہندوستانی فوج پکڑ کر نزدیک ہی نینے کوٹ تھانے میں لے گئی وہاں سے ہمیں گورداسپور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ہمارے ساتھ موضع بھگواڑی، بہائی پور، شالے اور دولے چک کی تقریباً سولہ نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لڑکیوں کو گورداسپور جیل میں ہمارے ساتھ والے چھوٹے سے بلاک میں رکھا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت اچانک زور زور سے رونے اور دل ہلا دینے والی چیخیں سنائی دیں۔ بعض لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ خدا کے واسطے ہمیں چھوڑ دو۔ ہمیں کچھ نہ کہو۔ ہم سمجھ گئے کہ ان لڑکیوں سے زیادتی کی جا رہی ہے۔ ان کی آبرو پر حملہ ہو رہا ہے لیکن ہم بے بس تھے۔ رات بے چینی میں گزری۔ صبح اٹھتے ہی جب ہم نے اس چیخ و پکار کے بارے میں جیل کے ملازمین سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ "بعض لڑکیاں پاگل ہیں اور وہ بلاوجہ چیخیں مار رہی تھیں۔"

انجاز نے کہا کہ مجھے یقین نہیں آیا اور حقیقت جاننے کے لئے جستجو کرتا رہا۔ ایک تیرہ سالہ لڑکی پر نظر پڑی تو اس کی جو حالت دیکھی وہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس رات کے بعد ان لڑکیوں کو نہ جانے جیل حکام کہاں لے گئے۔ (بحوالہ طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۶۲ء)

اس کے برعکس ۱۹۶۵ء کی جنگ کے سلسلہ میں بھارت کے (اس زمانے کے) وزیر دفاع مسٹر چوان نے وہاں کی پارلیمان میں علی الاعلان کہا تھا کہ اس سترہ روزہ جنگ میں کوئی ایک واقعہ بھی ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نگاہوں سے دیکھا ہو۔ (بحوالہ طلوع اسلام۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۶ء۔ صفحہ ۳۲)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ بھارت میں مسلم کش حوادث کی اصل و بنیاد کے سمجھنے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس قوم کے مذہب، تاریخ اور روایات پر گہری نگاہ ہو۔ فطرت نے پرویز صاحب کو اسی قسم کی نگاہ عطا کی ہے اس لئے وہ اس موضوع پر اکثر لکھتے رہے ہیں۔ اب جبکہ اس سلسلہ میں ملک گیر تقاضے موصول ہوئے ہیں انہوں نے اپنی ان نگارشات کو ایک جامع خطاب کی شکل میں قلمبند کر دیا ہے جسے پیش خدمت قارئین کیا جاتا ہے۔

پرویز صاحب کا خطاب

ہماری نئی نسل جو یا تو تقسیم ہند کے وقت جھولوں میں تھی، اور یا اس کی پیدائش تشکیل پاکستان کے بعد ہوئی، اس اعتبار سے تو ایک گونہ خوش قسمت ہے کہ اسے ہندو کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہی چیز قوم کے حق میں بڑی مضرت رساں ہے کہ اس نئی پود کو معلوم ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ اس باب میں ہمارے ارباب حل و عقد اور اعیانِ دانش و بینش نے بھی جو مجرمانہ تغافل برتا، فطرت اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے نہ تو ان نوجوانوں کی تعلیم کا کوئی ایسا انتظام کیا جس سے وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے کہ ایک الگ مملکت کا وجود کس طرح ہمارے دین کا بنیادی تقاضا اور بہ حیثیت قوم ہمارے زندہ رہنے کا واحد ذریعہ تھا —— یعنی اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہم اس قابل ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ —— یا بہ حیثیت مسلم قوم باقی رہ سکیں۔ اور نہ ہی کوئی ایسی تاریخ مرتب کی گئی جس سے انہیں کم از کم اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ ہندو کیا ہے اور کوئی شریف انسان اس کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تاریخ مرتب کرنے سے ہمارا مقصود یہ نہیں کہ ہم اپنے نوجوانوں کے دل میں ہندو کی طرف سے خواہ مخواہ جذبۂ نفرت ابھارنا چاہتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ہندو، ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جائے تاکہ یہ اسے اپنے جیسا انسان سمجھ کر اس کے دام فریب میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ ؎

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

یعنی فقط میری حالت دیکھ کر خلقت کے دل سینوں میں پگھل گئے۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ میرا پالا کس سے پڑا ہے تو نہ معلوم ان پر کیا گزرے؟

ہماری دشواری یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو ہندو کے ساتھ کبھی پالا نہیں پڑا —— اور خدا کرے کہ ایسا کبھی

نہ ہو ——— اور نہ ہی ہم نے، جنہیں ان کے ساتھ مدتوں پالا پڑتا رہا، انہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کی ہے کہ ہندو کیا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ہندوستان میں اچھے بھلے بستے رہتے تھے، ان سے الگ ہو کر ہم نے خواہ مخواہ ایک مستقل خطرہ کیوں مول لے لیا؟ اس کی ضرورت کیا تھی؟ وہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں کسی حد تک حق بجانب ہیں۔ حیوانات کے لئے آسانی یہ ہے کہ وہاں ہر نوع

انسان فریب میں آسکتا ہے

کی شکل و صورت جداگانہ ہوتی ہے جس سے انہیں ایک دوسرے کی پہچان میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کسی بکری کو اس میں مغالطہ نہیں لگ سکتا کہ جو جانور سامنے سے آرہا ہے وہ درندہ شیر ہے یا بے ضرر ہرن۔ لیکن انسانوں کے معاملہ میں صورت یہ نہیں۔ یہاں انسانی پیکر سب ایک جیسے ہوتے ہیں اس لئے اس باب میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ جو دوسرا انسان کھڑا ہے وہ رہزن ہے یا راہ نما۔ ہندوؤں کی شکل و صورت چونکہ انسانوں ہی جیسی ہے اس لئے ہمارے نوجوان انہیں انسان ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جنہیں وہ (محض پیکروں کے دھوکے میں) انسان سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت کیسے کیسے خونخوار درندے، مہیب نہنگ و اژدر یا مکار لومڑیاں ہیں۔ ان نوجوانوں کے سامنے ہندو کی ایک خفیف سی جھلک، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران آئی تھی، لیکن ایک تو وہ حادثہ ہی برق کی چشمک یا شرار کی چمک سے زیادہ دیرپا نہیں تھا، دوسرے ہم نے ابھی تک اس کی بھی کوئی صحیح اور مکمل تصویر ان کے سامنے آویزاں نہیں کی، اس لئے وہ خفیف سی جھلک بھی ان کے آئینہ ذہن سے محو ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں آج کی نشست میں اس "بھیروں ماتا" اس "کالی دیوی" کے چند ایک روپ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں ——— چند ایک اس لئے کہ اس کی مکمل تصویر کھینچنے کے لئے کئی ایک مجلدات درکار ہوں گی ——— سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ——— میرا خیال ہے کہ انہی چند ایک جھلکیوں سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا ہے۔

ہندوؤں کی ساری تاریخ میں ——— اگر جہالت و حماقت کے اس پلندے کو تاریخ کہا جا سکے ——— صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے، نام تو اس کا چانکیہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا۔ اور ہندو

ہندو اصولِ سیاست

بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس لقب سے ہی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ ذات شریف تھے کیا؟ اس نے اصولِ سیاست پہ ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ارتھ شاستر۔ یہ کتاب سنسکرت میں تھی لیکن اب اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں سیاست کے جو چند اصول بطور ضابطہ ہدایت دیئے گئے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ انہیں توجہ سے سنیئے:-

پہلا اصول ——— حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول ——— ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پہ ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول —— غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول —— جن سے دوستی رکھی جائے، ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیش نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

پانچواں اصول —— دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہمسایہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول —— دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کاروائیاں، ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریقہ سے داخل کرکے، فتنے کا عالم بنایا جائے۔ اور یہ سب کچھ مسلسل اور متواتر کیا جائے۔

ساتواں اصول —— رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ اور دوسرے ملکوں کے غداروں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول —— امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں سیاست کے وہ اصول جو ان کے ایک مہاتما نے انہیں دیئے۔ یہ مہاتما، ان کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار ہے —— یعنی وہ زمانہ جس میں (ان کے عقیدہ کے مطابق، بھارت میں) سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد کل جگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے جنہیں گاندھی جی کہا جاتا ہے۔ انہیں سچائی کا مجسمہ اور اہنسا (عدم تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی کیفیت کیا تھی، اس کے متعلق قائداعظمؒ کی زبان سے سنیئے جنہیں ان کے ساتھ رات دن واسطہ پڑتا تھا۔

گاندھی جی

قائداعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس (منعقدہ نومبر ۱۹۴۲ء) میں پبلک پلیٹ فارم پر سے کہا تھا کہ

> مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ (تقاریر قائداعظمؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۸۸)

اسی طرح انہوں نے ۷ اگست ۱۹۴۵ء کو بمبئی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں، وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں، معمہ ہیں۔ (تقاریر قائداعظم۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۸۲)

ان کی "مہاتمیت" کا یہ عالم تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لندن پر بمباری کی خبریں پڑھتا

ہوں اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گزرتی ہے، اسے سنتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، جنگ کے سلسلہ میں، بلا مشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

مہاتما جی نے اُدھر یہ کیا اور اِدھر کانگریس کی مجلسِ عاملہ سے یہ ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت، ملک کے اختیارات، کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، یہاں کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے، انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے ــــ اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو انہوں نے نہایت معصومیت سے فرمایا کہ میرا کانگریس پر کیا اختیار ہے۔ میں تو اس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں۔

مہاتما گاندھی اپنے آپ کو اہنسا کا اوتار کہا کرتے تھے۔ اہنسا کے معنی یہ ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی کے خلاف

اہنسا کا اوتار

تشدد کا استعمال نہ کیا جائے۔ انجیل کی ــــ ایک گال پر طمانچہ کھا کر، دوسرا گال سامنے کر دینے کی ــــ تعلیم پر عمل کیا جائے۔ لیکن انہی مہاتما جی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے، سندھ میں مسجد منزل گاہ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر بے حد مظالم ہوئے۔ ہندوؤں نے یہ سب کچھ بھی کیا اور کوٹلیا کے اصولِ سیاست کے مطابق، مہاتما جی کو تار دے دیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں۔ مہاتما جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ کسی تحقیق کی ضرورت سمجھی نہ تفتیش کی اور اپنے اخبار میں لکھ مارا کہ

> اہنسا ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ دوسرا طریق وہ ہے جسے ساری دنیا برتتی چلی آ رہی ہے یعنی جان و مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے۔ سندھیوں کو چاہیئے کہ لٹیروں اور حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سیکھیں۔ (ہریجن۔ بابت ۱۲/۱۲/۳۹)

یہی مہاتما جی ہیں جنہوں نے جنگ کے دوران انگریزوں سے کہا تھا کہ ہٹلر کا مقابلہ ہتھیاروں سے نہ کرو۔ اہنسا کے ذریعہ کرو۔ اور سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں کو اپدیش دیا تھا کہ پٹھانوں سے جا کہیں تو ان کا اہنسا میں ذرا سی بھی ہنسا کی لاگ نہ رہے۔ اور دوسری طرف کلکتہ کی ہندو عورتوں سے تاکیداً کہا جاتا تھا کہ اپنے پاس پستول اور بندوق رکھیں اور فائر کرنا سیکھیں۔ گاندھی جی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں۔ میں گاؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بُت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔ (ینگ انڈیا۔ ۲۱/۱۰)

جو گاؤ رکھشا ان کے دھرم کا جزو تھی، اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

> یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یورپین کے لئے گاؤکشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے مگر ایک ہندو بھی، ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ ہندومت: عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤکشی کو بند کر دیں۔ (الفضل۔ ۱۸ تمبر ۹ء بحوالہ سٹیٹسمین)

یہ تھی سچائی کے افتاء اور اہنسا کے دیوتا گاندھی جی کی کیفیت۔ گاندھی جی کیا تھے، اس کے متعلق قائد اعظمؒ نے ایک فقرہ میں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جس کے لئے کتابوں کی کتابیں بھی کافی نہیں ہو سکتیں۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن گاندھی جی شوگرام آشرم میں، اپنی کٹیا میں بیٹھے پرارتھنا میں محو تھے کہ ایک کونے سے ایک سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی خاموشی سے پرارتھنا میں مصروف رہے۔ اس نے کٹیا کا چکر کاٹا اور آہستہ سے باہر چلا گیا۔ ہندو اخبارات نے اسے مہاتما جی کی کرامت قرار دے کر بہت اچھالا۔ صبح کو یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو ایک اخبار کا رپورٹر قائد اعظمؒ کے پاس گیا اور اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ قائد اعظمؒ نے سر ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے کہا:۔

YES; PROFESSIONAL ETIQUETTE

یہ وہ ریمارکس ہیں جن کا بس لطف لیا جا سکتا ہے، سمجھایا نہیں جا سکتا۔

ہندومت کا ضابطۂ اخلاق

جس قوم کے "مہاتما" ایسے ہوں، اس کے عام افراد جس سیرت و کردار کے مالک ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسٹر سری پرکاش پاکستان میں، بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۴۸ء کی شام، تھیاسوفیکل ہال کراچی میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندومت ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے"۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندومت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندومت انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول و اقدار پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ہر موقعہ اور ہر مقام کے لحاظ سے، مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کھشتریوں) کو قتل و خون ریزی سکھاتا ہے۔ وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو۔ لیکن ویشیوں (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے، اس لئے وہ انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تاکید کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

> کسی کو یہ بات اچھی لگے یا نہ لگے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندومت

میں کوئی اصولِ زندگی قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندو مت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا، اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندو مت ہزاروں سال سے، مختلف حالات اور متباین ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔

(طلوع اسلام۔ بابت دسمبر ۱۹۴۸ء)

لال بہادر شاستری

یہی ہے وہ ہندو دھرم، جس کے سب سے بڑے عالم[1] اور ہندوستان کے (اُس زمانے کے) وزیر اعظم، مسٹر لال بہادر شاستری نے، جنوری ۱۹۶۵ء میں بنارس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ رویہ ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی راستہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن و خوشحالی کا ہے جو قوم کے باپو، مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدم تشدد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا ہے وہ نہ صرف نظری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے جب ہم پوری دنیا میں امن و صلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟

(اخبار مدینہ۔ بجنور۔ یکم جنوری ۱۹۶۵ء بحوالہ طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۶۵ء)

یہ کچھ انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے جنوری میں کہا، اور اسی سال ستمبر میں چوروں کی طرح، اکیس ڈویژن فوج، پاکستان کے سر پر لاکھڑی کر دی۔ سچ ہے۔ اُس قسم کے "باپو" کے اسی قسم کے سپوت ہونے چاہئیں!! یہی تھے وہ بہادر شاستری جی، جن کی حکومت سے خود ہندوستان کے صحافی، تنگ آکر چیخ اٹھے تھے کہ

> شاستری حکومت ایک سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی جاتی ہے اور ہم فانی انسان اس کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔ حساس طبائع نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حکومت کا سربراہ ــــ مسٹر شاستری ــــ خود اس کائیں کائیں کا منجھا ہوا فنکار ہے۔

(شو ایچ۔ بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۲/۵۔ طلوع اسلام ستمبر ۱۹۶۶ء)

یہ ہے ہندو دھرم۔ اور یہ ہیں اس دھرم کے پجاری ــــ کوٹلیا سیاست کا امام مہاتما گاندھی، ستیا کے اوتار اور شاستری (آنجہانی) اُس باپو کے نامور سپوت!

یہ ہے ہندو دیوتا کے مجسمہ کا ایک روپ۔ اب آگے بڑھئیے!

---

[1] شاستری، بہت بڑے عالم کو کہتے ہیں۔ یعنی جو شاستروں کا علم رکھتا ہو۔

مذہب کے متعلق

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رُو سے، ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے دین کی بناء پر ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قوانینِ خداوندی نافذ کر سکیں۔ یہ دعویٰ مسلمانوں کا تھا جس کا تعلق مسلمانوں کے "مذہب" سے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی غیر مسلم کو دخل دینے کا حق ہی نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن دیکھئے کہ ہندوؤں کا اس باب میں رویہ کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کانگریس منعقدہ مارچ ۱۹۳۶ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دُنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت جون ۱۹۳۸ء)

یہ تو رہا، دو قومی نظریہ کے متعلق۔ خود مذہب کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں لکھا:۔

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقاء کا حمایتی ہے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۳۸ء)

آپ کہیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہریہ تھے اس لئے مذہب کے متعلق ان کا یہ طرزِ عمل حق بجانب تھا۔ وہ سیکولر نظام کے حامی تھے۔ اس لئے ان کی اس مخالفت میں، اسلام کی خصوصیت نہیں، وہ تمام مذاہب کے مخالف تھے۔ لیکن اوّل تو آپ نے اس اقتباس میں "منظم مذہب" کی تخصیص پر غور نہیں فرمایا۔ منظم مذہب —— یعنی وہ مذہب جو مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ تنظیم کا حامی ہے (جسے قوم کہا جاتا ہے) ہندومت نہیں، اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ پنڈت جواہر لال ہندومت کو سرے سے مذہب ہی قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی کتاب "میری کہانی" میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں، مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارواک)، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ جب پنڈت نہرو کے نزدیک ہندومت کوئی مذہب نہیں تھا، تو اسے مٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اسلام تھا جو ان کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور جسے وہ مٹانا چاہتے

تھے۔ چنانچہ اس کی تصریح، نہرو کے ہم مرتبہ ایک کانگریسی لیڈر مسٹر ولبھائی ڈیسائی نے ان الفاظ میں کر دی کہ

> اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔

(ہندوستان ٹائمز ۳/۵ - بحوالہ طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۳۸ء)

قرآنی حکومت کے خلاف

اور اگر آپ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو وہ بھی سن لیجئے۔ ۱۹۴۱ء میں "اکھنڈ بھارت کانفرنس" کا اجلاس لدھیانہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ تمہیں اس کا علم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

> مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

> ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کرلیں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد شمشیر و سناں کا نشانہ بنائے جائیں گے، ان کی عورتوں کی عصمت دری اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوگی۔

(بحوالہ طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۱ء)

یہ خیالات تنہا مسٹر منشی کے نہیں تھے۔ یہ ترجمانی کر رہے تھے ہندوؤں کے تمام بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے خیالات اور جذبات کی۔ مثلاً کانگرس کے سب سے بڑے ترجمان، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۴ ر نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا:-

> حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔

یہاں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہندو نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کی کوشش کریں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا اور پاکستان کی مملکت وجود میں آگئی تو اس وقت بھی

اسلامی حکومت کے خلاف

ہندوؤں کی پکار یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی الگ مملکت قائم کرلی تو خیر لیکن ہم (یعنی ہندو) اسے برداشت نہیں کر سکیں گے کہ وہ وہاں اسلامی حکومت قائم کرلیں۔ قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا:-

> پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس

حقیقت ہے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اپنی مقالہ افتتاحیہ میں) کہا کہ

اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں محترم لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

اس سیاسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ

تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی سٹیٹ ہوگا...... چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے۔

لیکن تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے متعلق تو یہ کچھ کہا جا رہا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہا جاتا تھا کہ

ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو سٹیٹ ہونا چاہئیے جس کا کلچر ہندو جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۳ء)

یہ الفاظ ڈاکٹر رادھا مکرجی کے تھے جو ہندو مہا سبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے۔ یہ الفاظ انہوں نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے۔

اور مسٹر ساورکر نے یہ کہہ کر ساری ٹنٹا ہی ختم کر دیا تھا کہ

لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر، نسل اور روایات وغیرہ۔ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔

(سٹیٹسمین ۲ فروری ۱۹۳۹ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۳۹ء)

آپ غالباً متعجب ہوں گے کہ اس باب میں گاندھی جی کا ذکرِ خیر آیا ہی نہیں۔ کیا وہ خاموش بیٹھے تھے! جی نہیں۔ گاندھی جی ایسے اہم معاملہ میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کا بات کرنے کا انداز اپنا تھا۔ سنیئے کہ اس باب میں وہ کیا کرتے اور کیا کہتے تھے۔

مسٹر گاندھی کا اپدیش

مسٹر گاندھی نے ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا تھا جس میں کہا تھا:-

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

پھر انہوں نے اپنے اخبار "ہریجن" کی ۹ فروری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں لکھا:۔

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے اپنی جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے[1]۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ، مذہب، ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

آپ کہیں گے کہ مسٹر گاندھی سیکولر نظام حکومت کے قائل تھے، اور سیکولر نظام حکومت کے قائل کو مذہب کے متعلق یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسٹر گاندھی، واقعی سیکولر نظام حکومت کے قائل تھے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں، اس خط کے الفاظ سے لیجئے جو قائد اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کو یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا:۔

> آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعین میں مذہب کو کوئی دخل ہونا چاہیئے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا زندگی میں مقصد کیا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو ہمیں کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے ـــــ کیا وہ جذبہ، وہ مقصد، مذہبی ہے یا معاشرتی، یا سیاسی ـــــ تو آپ نے کہا تھا کہ "خالص مذہبی"۔

یعنی اپنی سیاسی جدوجہد کا جذبۂ محرکہ خالص مذہبی، اور دوسروں کو تلقین کہ وہ مذہب کو سیاست میں دخیل کار نہ ہونے دیں۔ یہی تھی مسٹر گاندھی کی وہ دو رُخی پالیسی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را — نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر — بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

اور مسلمانوں کا یہ طعن کسی مفروضہ پر مبنی نہیں تھا، ایک حقیقت تھا۔ مسٹر گاندھی اِدھر ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھو۔ اور اُدھر، ہندوستان میں وہ جس

ہندوستان کی حکومت

قسم کی سیاست رائج کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق، کانگریس کے جنرل سیکرٹری، اچاریہ کرپلانی نے اگست ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ

> گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت

---

[1] ہندو مذہب کیا ہے، اس کے متعلق کسی دوسری نشست میں عرض کیا جائے گا۔

سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو، بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دَور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

واردھا اسکیم

مسٹر گاندھی کو سب سے بڑا ڈر یہ کھائے جا رہا تھا کہ مسلمان بچوں کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہوتا ہے کہ اسلام، باقی مذاہب کے مقابلہ میں افضل ہے۔ ان کی سکیم یہ تھی کہ مسلمان بچوں کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے تاکہ ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی عظمت و اہمیت کا احساس مٹ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خان (مرحوم) کے مشورہ اور تعاون سے ہندوستانی بچوں کے لئے ایک مشترکہ تعلیم کی سکیم مرتب کی (جو واردھا کی تعلیمی سکیم کے نام سے مشہور ہوئی) اس سکیم کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ مسٹر گاندھی کے اس وضاحتی بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں اخبارات کو دیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:-

> مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں، رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے، اس کے پیشِ نظر میں اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی مذہب سچا ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز ۱۷؍۸؍۳۸ ۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۳۸ء)

[طلوعِ اسلام نے اسی زمانے میں اس انتہائی شر انگیز تعلیمی سکیم کے خلاف کس قدر ملک گیر مہم چلائی اور کس طرح اسے اور اس کے تحت مرتب کردہ نصاب کی کتابوں کو غرقِ سمندر کرا دیا، یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں]

مطالبہ پاکستان کی مخالفت

لیکن جب،   اور ان کے چیلوں چانٹوں کی ان تمام سازشوں اور روباہ بازیوں کے باوجود، تحریکِ پاکستان آگے بڑھتی گئی حتیٰ کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں حصولِ پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہو گیا تو مسٹر گاندھی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے، ۱۰ اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنے ایک بیان میں کہا:-

> میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ "اسلام" کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

پھر انہوں نے اسی سلسلۂ مضامین کی دوسری قسط میں (۱۴/ اپریل ۱۹۴۰ء کو) لکھا :۔

> میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔
> میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے ۵ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا کہ

> میں ایک تنگ نظر ہندومت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسرے میں مدغم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں کے متعلق، ہندوستان کے ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ مولانا حالیؔ نے بھارت کو "اکال الامم" کہا ہے۔ یعنی وہ کالی دیوی جو ان تمام قوموں کو نگل گئی جو زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک باہر سے آئی تھیں۔

اکال الامم

جب وہ قومیں ہندوستان میں آئی تھیں تو ان کا جداگانہ تشخص، جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب، جداگانہ تہذیب تھی، لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ ان کے جداگانہ وجود کا نشان تک اس طرح مٹ گیا گویا وہ کبھی دنیا میں موجود ہی نہ تھیں۔ وہ سب ہندو بن گئیں۔ لیکن ان سب میں "مسلمان سخت ہڈی کے نکلے۔" ہندوؤں کی تمام چالوں کے باوجود ان میں جذب نہ ہوئے اور ان کی یہی سخت جانی تھی جو ہندو کے لئے خار پہلو بن رہی تھی۔ مہاتما جی اور ان کے چیلوں کی، مسلمانوں کے غم میں" یہ تمام دردناک آہیں" اور جگر گداز نالے" اسی کانٹے کی کھٹک کا نتیجہ تھیں۔ پہلے انہیں یہ غم ستا رہا تھا کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندہ کیوں ہیں اور اب یہ صدمہ مار رہا تھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان کے بڑے سے بڑے مہاپرشؔ اپنی جاتی کے سپوتوں سے للکار للکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھنا، یہ کہیں جانے نہ پائیں۔ سردار پٹیل نے مارچ ۱۹۴۲ء میں احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا :۔

> جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں" ان میں سے نوّے فیصد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ ان لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔ (طلوع اسلام۔ اپریل ۱۹۴۲ء)

ہندوؤں کے دل میں" مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دینے کے یہ خیالات اور عزائم تحریک پاکستان کے پیدا کردہ نہیں تھے۔ وہ زمانہ دراز سے انہی خطوط پر سوچ بھی رہے تھے اور گامزن بھی تھے۔ اس تفصیل میں جانے کے لئے تو مجھے ہندوستان کی تاریخ کے سینکڑوں صفحات سامنے لانے پڑیں گے (جو سردست مشکل ہے)۔ میں صرف سیواجی کے حوالے سے چند ایک واقعات پر اکتفا کروں گا۔ لیکن اس کے لئے بھی پہلے اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ

... ہندو شاستروں کی تقسیم عمل کی رو سے سلطنت کی حفاظت کا ذمہ کھشتریوں کا ہوتا ہے اور بظاہر حکومت کے سربراہ بھی وہی ہوتے ہیں لیکن زمامِ حکومت درحقیقت برہمنوں کے ہاتھ میں رہتی ہے اور ان کے فیصلوں کے خلاف کوئی راجہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کی سلطنت کے خلاف جتنی سازشیں ہوئیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں برہمنوں ہی کی پیدا کردہ تھیں —— آج بھی ہندوستان کی حکومت براہمنوں ہی کے ہاتھ میں ہے —— مغلیہ سلطنت کے انحطاط پر، سب سے پہلے اس کے خلاف

سیواجی

مرہٹوں کو ابھارا گیا۔ سیواجی ابھی نوعمر ہی تھا کہ سمرتھ رامداس نامی براہمن نے مسلمانوں کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس نے (لالہ لاجپت رائے کے الفاظ میں جنہیں انہوں نے اپنی تصنیف سیواجی کی سوانح حیات میں قلمبند کیا ہے) "سیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اپدیش دیا۔ اس امر کی شہادت اس خط سے بھی ملتی ہے جو سیواجی نے راجہ جے سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس میں اس نے تحریر کیا تھا :-

> میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک اور ہی مہم کے لئے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیئے تھا جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ہی انہیں انصاف کرنا آتا ہے .... میری بادلوں جیسی گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک سارے مسلمان اس سیلاب خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔[1]

سیواجی اپنے مذموم ارادوں میں ناکام رہ کر دنیا سے چل بسا، تو اسی برہمن سمرتھ رامداس نے اس کے بیٹے، سنبھاجی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اس نے اس سے کہا کہ

> آپس میں محبت سے رہو لیکن اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈ کر اپنے راستے سے ہٹا دو ..... لوگوں کے دل میں ان ملیچھوں کا مقابلہ کرنے کا خیال پیدا کرو۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ بھائی پرمانند)

سنبھاجی کے بعد اس کا بیٹا، ساھو برسرِ اقتدار آیا تو اسے ایک اور برہمن —— باجی راؤ —— نے مسلمانوں کے خلاف مشتعل کیا اور کہا کہ "ان ملیچھوں کو بھارت ورش کی پوتر بھومی (مقدس سرزمین) سے نکال باہر کرنا، تمہارا دھارمک (مذہبی) فریضہ ہے"۔ اس کی تقریر کا یہ فقرہ آج تک ہندوؤں کے ہاں دہرایا جاتا ہے کہ

> کاٹو۔ درخت کو تنے سے کاٹو تو شاخیں خود بخود گر جائیں گی۔ میری بات کو مانو تو میں اٹک کی دیوار پر مرہٹوں کا جھنڈا نصب کر دوں گا۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ بھائی پرمانند)

لیکن اس منصوبے کو احمد شاہ ابدالی نے خاک میں ملا دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد، مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان قعرِ مذلت میں گر گئے۔ لیکن ہندوؤں

---

[1] مجلد و دیہ کیشری شیواجی، مصنفہ پنڈت نند کمار شرما۔ اور سیواجی مصنفہ لالہ لاجپت رائے۔

کے دل میں ان کے خلاف نفرت و عداوت کی جو آگ تھی وہ بجھ نہ سکی۔ یہ اس لئے کہ اس قدر انحطاط اور زوال کے باوجود مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے باقی تھے۔ وہ ہندو قوم کا جزو بننے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، اب ہندو کے سامنے جنگ کا میدان نہیں تھا، سیاست کی بساط تھی۔ اور اس

تلک اور دیانند

بساطِ سیاست کے اوّلین شاطر پھر دو برا ہمن تھے ——— ایک بال گنگا دھر تلک اور دوسرا سوامی دیانند سرسوتی (آریہ سماج کا بانی) ان کا جامع منصوبہ یہ تھا کہ مسلسل اور وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ کے ذریعے، ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو منظم کر کے، ایک متحدہ محاذ کی شکل دے دی جائے۔ اس سازش کے جال اس قدر وسیع اور اس کے عزائم اس قدر خطرناک تھے کہ خود حکومت کو ان کی تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی بٹھانی پڑی جو اس کے صدر (مسٹر جسٹس ایس۔ اے۔ ٹی۔ رولٹ) کی نسبت سے رولٹ کمیٹی کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو اس سے عجیب و غریب کوائف کا انکشاف ہوا۔ تلک نے ہندوؤں کے دو میلے منعقد کرنے کی طرح ڈالی تھی۔ یہ تحریک بظاہر بڑی معصوم سی تھی لیکن اس میں کس قدر خطرات پوشیدہ تھے اس کا اندازہ کمیٹی کی رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا۔

گنپتی کا میلہ

مغربی ہندوستان میں اس تحریک کے آثار ابتداء میں دو سالانہ میلوں میں رونما ہوئے جن میں ایک تو ہندو دیوتا گنپتی کے اعزاز میں منعقد ہوتا ہے اور دوسرا مرہٹہ سردار سیواجی کے اعزاز میں جس نے اہالیانِ دکن کو مسلمان حکمرانوں کے خلاف متحد کیا تھا۔ گنپتی کے میلے کی دھوم دھام سے منائے جانے کی رسم تازہ معلوم ہوتی ہے۔ خیال غالب ہے کہ بمبئی میں ۱۸۹۳ء میں جو فساد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اس کے بعد مفسدوں نے ہندو مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کا بہترین ذریعہ یہ سوچا کہ گنپتی کا میلہ اعلیٰ پیمانے پر منعقد کیا جائے .... اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو زخمی کیا جائے .... اس خیال کو لے کر ستمبر ۱۸۹۴ء میں مفسدوں نے اس معمولی پوجا کو عالمگیر نمائش بنانے کے انتظامات کے لئے میلے کی ایسی جگہ منتخب کی جہاں عوام بآسانی جمع ہو سکیں۔ نیز ایسا انتظام کیا گیا کہ جو لوگ گتکا بازی اور دیگر جسمانی ورزشوں کے ماہر ہوں وہ گنپتی کے حضور اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ متواتر دس دن تک نوجوانوں کے گروہ گلیوں اور بازاروں میں ایسے اشعار گاتے پھرتے جن سے مسلمانوں اور حکومت کی مخالفت مقصود تھی .... قدرتاً اس تہوار سے بدامنی اور فساد کی کئی وارداتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک موقعہ پر ساٹھ ستر آدمیوں کے جلوس نے ایک مسجد کے قریب سے گزر کر مسلمانوں کے مذہبی مراسم میں دخل اندازی کی۔

گنپتی کے اس میلے میں اس قسم کے اشلوک گائے جاتے تھے :۔

---

[۱] پاکستان کے معمار اوّل سرسیدؒ نے یہ بات اعلانیہ کہہ دی تھی۔

> بدطینت لوگ قصائیوں کی مانند جلادوں کی سی بے رحمی سے گائیوں اور بچھڑوں کو ذبح کرتے ہیں۔
> اٹھو اور گاسے ماتا کی مدد کرو!

دوسری طرف، سیواجی کے جنم دن اور تاجپوشی کے دن کی تقاریب پر پونا میں اسی قسم کے میلے منعقد کئے جانے لگے جن میں جی بھر کر مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے تھے۔ ان میلوں میں اس قسم کے شلوک پڑھے جاتے تھے:۔

> یاد رکھو! محض سیواجی کی کہانی سنا دینے سے آزادی حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ ضروری ہے کہ لوگ سیواجی اور باجی راؤ کی مانند اولوالعزمانہ جانبازی دکھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب تم کو ڈھال تلوار سے مسلح ہو جانا چاہیئے کہ ہم نے دشمن کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم دشمنوں کو مار کر مریں گے تم عورتوں کی طرح بیٹھے کہانیاں سنتے رہو گے۔

اسی میلہ کے ایک اجلاس میں خود تلک صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے صدارتی ریمارکس میں کہا :۔

آریہ سماج

> سوال یہ ہے کہ کیا سیواجی نے افضل خاں کو قتل کر دینے میں کوئی پاپ کیا تھا؟ اس کا جواب مہابھارت کے اوراق میں ملے گا۔ بھگوان کرشن کا صاف اپدیش ہے کہ نشکام کرم ہوتے ہوئے بیشک اپنے گورو اور رشتے دار تک کو ہلاک کر دو۔ تم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوگا۔ افضل خان کے قتل میں سیواجی کی ذاتی اغراض پوشیدہ نہ تھیں۔ اس نے جو کچھ کیا رفاہ عامہ کی خاطر کیا تھا۔ اس کے قتل کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہمارے مکان میں چور داخل ہو جائیں اور ہم دیکھیں کہ ان کو نکالنے کے لئے ہم میں کافی قوت نہیں ہے تو چاہیئے کہ انہیں اندر بند کر کے مکان کو آگ لگا دیں اور ان کو زندہ جلا دیں۔

ہم نے پہلے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کی تحریک کے بانی بال گنگا دھر تلک اور سوامی دیانند تھے۔ تلک کے عزائم کی ایک جھلک ہمارے سامنے آ گئی۔ سوامی دیانند نے ہندوؤں کی ایک ملک گیر تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام آریہ سماج تھا۔ اس کے قیام کا مقصد، اس تنظیم کے ایک معروف لیڈر، لالہ دھنپت رائے نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا :۔

> ہندوستان میں سوائے ہندو راج کے دوسرا راج ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک دن آئے گا کہ ہندوستان کے سب مسلمان شدھ ہو کر آریہ سماج ہو جائیں گے اور اس طرح آخر یہاں ہندو ہی رہ جائیں گے۔ یہ ہمارا آدرش (نصب العین) ہے۔ یہی ہماری آشا (آرزو) ہے۔ سوامی جی مہاراج نے آریہ سماج کی بنیاد اسی اصول کو لے کر ڈالی تھی۔
> (اخبار پرکاش۔ لاہور۔ ۲۶ اپریل ۱۹۲۵ء)

گئو رکھشا

اسی سطح پر مسلمانوں کے خلاف جذبات نفرت و انتقام کی آگ بھڑکانے کے لئے، سوامی دیانند نے گئو رکھشا (گائے کی حفاظت) کا شاخسانہ کھڑا کیا۔ واضح رہے کہ ویدوں اور شاستروں کی رو سے، گائے کا گوشت کھانا نہ صرف جائز ہے بلکہ اسے دیوتاؤں کے استھان پر بطور نذر نیاز چڑھانے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ لہٰذا، گئو رکھشا کا سوال محض مسلمانوں کے خلاف جذبات نفرت مشتعل کرنے کا ایک عوامی حربہ تھا۔ چنانچہ بادپرتاپ کے ایڈیٹر، مہاشہ کرشن نے اس باب میں لکھا تھا کہ

گئو رکھشا کے سوال کا آریہ سماج کے ساتھ بہت سمبندھ (تعلق) ہے کیونکہ اس پر بھارت ورش کا جیون نربھر (زندگی کا دارومدار) ہے۔ گئو رکھشا پر سب سے پہلے لیکچر رشی دیانند جی نے دیئے تھے...... اور وہ چاہتے تھے کہ گاؤکشی کو قانوناً بند کرا دیا جائے۔

(پرتاپ۔ لاہور۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۰ء)

اور اخبار ملاپ نے اپنی ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

گئو ہتیا رے (گائے پر ظلم کرنے والے) کو سیسے کی گولی سے اڑا دینے کے لئے شاستروں میں آگیا (حکم) ہے۔

آریہ سماجی عام جلسوں میں اسی قسم کی اشتعال انگیز تقریریں کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۶ء میں سکھر کے ایک جلسہ میں جہاشے پرتاپ سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

گائے ماتا کے گلے پر چھری پھیرنے والوں کے لئے تمہارے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہونا چاہئے بھیشم کے سپوتو! ارجن کے دلاورو! اگر تم ایک گائے کی خاطر کراچی سے مکہ تک تمام مسلمانوں کو (بھی ختم کر دو) تو بھی تھوڑا ہے۔

مہاتما گاندھی

(مہاتما) گاندھی کو اہمسا (عدم تشدد) کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ اس باب میں ذرا ان کا دیا کھیان بھی سن لیجئے جسے پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گائے کشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں، عیسائی یا مسلمان کو بزورِ شمشیر بھی گاؤکشی کو چھوڑنے پر مجبور کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

(سٹیٹسمین۔ بحوالہ الفضل۔ ۹ مارچ ۱۹۱۸ء)

ان اشتعال انگیز بیانات اور تقاریر کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں جگہ جگہ گاؤکشی کی بناء پر ہندوؤں نے فسادات برپا کئے اور ان کا سلسلہ آج تک جاری ہے

مسلمانوں کو ہندو جاتی کے اندر جذب کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو شدھ کرکے ہندو بنا لیا جائے۔ واضح رہے کہ کسی غیر ہندو کو ہندو مذہب میں داخل کرنے کا تصور یکسر ہندو مذہب کے خلاف ہے۔ ہندو

شدھی کی تحریک

مذہب تبلیغی ہے ہی نہیں۔ ہندو وہی ہو سکتا ہے جو ہندوؤں کے گھر پیدا ہو جس مذہب میں پیدائشی ذات (ورن) تک نہ بدلی جا سکتی ہو اس میں تبدیلیٔ مذہب سے کسی کو ہندو بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کے لئے شدھی کو بھی جائز قرار دیا گیا اور یہ تصور بھی سوامی دیانند جی کا ایجاد کردہ تھا۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے، سوامی دیانند کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ

سوامی دیانند پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کو شدھی کی طرف راغب کیا۔

شدھی سے اصل مقصد کیا تھا، اس کی بابت، ایک اور ہندو کی زبان سے سنیئے۔ اخبار پرتاپ (لاہور) کے ایڈیٹر نے ۱۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو لکھا تھا:۔

ہندو کیا کریں جب کہ دنیا کا نظام ہی تعداد کے سہارے چل رہا ہو۔ اس ملک کی حکومت صرف تعداد کے اصول پر قائم ہے جس کے لئے ہندوستانیوں کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہاں کونسلوں میں ادھیکار (اختیارات) بھی تعداد کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں عملی طور پر مسلم حکومت ہے۔ ہم پنجاب میں رہتے ہوئے جانتے ہیں کہ مسلم حکومت کیا ہے؟ اس وقت شدھی ہندوؤں کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن رہی ہے۔ مسلمان ترقی سے سات کروڑ تک پہنچ چکے ہیں۔ عیسائی چالیس لاکھ ہو چکے ہیں۔ سات کروڑ مسلمانوں کے سامنے بائیس کروڑ ہندوؤں کا رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر کہیں ان کی تعداد بڑھ گئی تو نہ معلوم کیا ہوگا۔ دھرم کو دھرم کے لئے ہونا چاہیئے لیکن ہندوؤں کو تو دوسری ضروریات نے مجبور کر دیا ہے کہ اپنے بھولے بھٹکے بھائیوں کو گلے لگائیں اور جو ان کے بھائی بننا چاہیں ان کو اپنا بھائی بنائیں۔ ہندو اگر اب بھی نہ جاگے تو ان کا کام ختم ہے۔

واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اہل ہند کو سیاسی اصلاحات کی رو سے کچھ اختیارات مل رہے تھے اور یہاں جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ شدھی کی تحریک اسی کی پیش بندی کے لئے اختیار کی گئی تھی۔

دہلی سے شائع ہونے والے اخبار تیج نے ۱۹۲۶ء میں اپنے کرشن نمبر میں لکھا تھا:۔

جن گائیوں کو بھگوان کرشن شردھا (عقیدت) کے ساتھ جمنا ندی کے پوتر استھان (مقدس مقام) پر چرانے تھے، آج تم ان کی رکھشا کرو اور ان کو گئو ہتیا کاروں کے مظالم سے بچاؤ۔ یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے جب آپ شدھی، سنگھٹن اور دلت ادھار کا اپنے دل میں نشچے (عہد) کر لیں ...
یہی گوپال (گائیوں کے پالنے والے کرشن) کی سچی بھگتی ہوگی۔ اسی سے ہمارا راشٹر بنے گا۔ اسی سے ہمارے اختلافات مٹیں گے۔ اسی سے باجا اور مسجد کا سوال حل ہوگا۔ اسی سے ہمیں ہماری سوتنترتا پراپت (آزادی حاصل) ہوگی۔ دنیا میں پھر آریہ دھرم کا جھنڈا بلند ہوگا۔ بھارت چکرورتی راج، (عالمگیر حکومت) کا سوامی (مالک) بنے گا۔

اچھوتوں کو جذب کرنا

گئو رکھشا اور سنگھٹن کی تحریکوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں دلت اُدھار کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ بھی جمہوریت کا توڑ تھا۔ دلت ادھار کے معنی ہیں اچھوتوں کی اصلاح۔ ہندو دھرم کی رو سے اچھوت (یا شودر) وہ چوتھا ورن ہے جس میں جنم لینے والے کسی اونچی ذات کے ہندو کو چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ پیدائشی ناپاک ہوتے ہیں اور ساری عمر ناپاک رہتے ہیں یہ درحقیقت ہندوستان کے قدیم اصلی باشندے تھے جنہیں ہندوؤں نے اپنی خدمت کے لئے غلام بنا رکھا تھا۔ یہ کبھی ہندوؤں کا جزو نہیں بن سکتے تھے۔ ان کا جزو بننا تو ایک طرف، منوسمرتی میں لکھا ہے کہ

اگر کوئی شودر کسی دو جے کے برابر بیٹھے تو اس کی کمر میں داغ دے کر اسے گاؤں سے نکال دینا چاہیئے۔ یا اس کے چوتڑوں کو تھوڑا سا کاٹ ڈالنا چاہیئے۔

اچھوت تو ایک طرف، پنڈت مدن موہن مالویہ جیسا تعلیم یافتہ، بین الاقوامی شہرت کا لیڈر بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ

میں جب کسی انگریز سے ملتا ہوں تو ملنے کے بعد پانی سے ہاتھ دھو لیتا ہوں۔

اچھوتوں کو ہندو قرار دینے سے مقصد کیا تھا، اس کے متعلق اخبار ملاپ نے اپنی ۲۲ جنوری ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

ہندوؤں کے لئے اچھوت ادھار کا مسئلہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ مردم شماری میں ہندوؤں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ جب کہ مسلمان اور دیگر اقوام ترقی کر رہی ہیں۔ ایک ہندو کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے وقت اور دھن کا کچھ حصہ اچھوت ادھار کے لئے صرف کرے۔

اسی اخبار میں مسٹر کیلکر جیسے ہندو لیڈر نے لکھا تھا کہ

خود غرضی کے خیال سے بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اچھوت ادھار کے کام کو ہاتھ میں لے کر اچھوتوں کو جلد از جلد اپنے اندر ملالیں کیونکہ موجودہ حکومت میں تعداد ہی ایسی چیز ہے جس پہ حکومت میں نمائندگی کا دارومدار ہے۔

اچھوتوں میں تبلیغ کا کام مسلمانوں نے بھی شروع کیا تھا۔ ہندو اسے کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کے متعلق، اور تو اور، خود (مہاتما) گاندھی کی زبان سے سنئیے۔ جب انہوں نے سنا کہ مسلمانوں نے کچھ اچھوتوں کو مسلمان بنا لیا ہے تو

انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ "مجھے تو اس کا پتہ تک نہیں۔ آپ کی غلطی ہے جواب تک خاموش رہے۔ یہ بہت برا ہوا۔ کم از کم مجھے اس کی اطلاع ملنی چاہیئے تھی۔ اچھوت ادھار کا کام صرف ہندوؤں کا ہے"۔ (پرتاپ ۲۴ / ۲ / ۲۰)

ایک طرف اچھوتوں کو ہندو قرار دے کر جمہوری طریق سے ہندو راج کے منصوبوں کو تقویت پہنچائی جا رہی تھی

ہندو سنگھٹن

اور دوسری طرف، ہندو تنظیم (سنگھٹن) کو مستحکم کر کے، بزور شمشیر ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں چنانچہ تحریک سنگھٹن کے مشہور رہنما، لالہ ہردیال نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ بھارت ورش میں ایک ایسی مضبوط، زبردست، متحد اور بیدار سیاسی جماعت قائم کی جائے جو ایک آزاد ہندو ریاست کے آدرش (نصب العین) تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہے۔ گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق ایک ایسا دل بنایا تھا۔ آج بھی سوراج پارٹی، انڈی پینڈنٹ پارٹی، لبرل پارٹی وغیرہ سیاسی جماعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ ایسا ہندو قومی دل قائم کیا جائے جو ایک آزاد قومی ریاست کی بنیاد ڈالے۔ جب انگلستان کچھ عرصہ بعد ہوم رول یعنی (۷۵) فیصد سوراج ہمیں پیش کرے تو وہ ہندو قومی دل کے ساتھ عہد و پیمان کرے۔

ہندو سنگھٹن کا آدرش (نصب العین) یہ ہے کہ ہندو قومی سنستھاؤں (انسٹی ٹیوشنز) کی بنیاد

پر ہندو قومی ریاست قائم کی جائے۔ ہندو قومی منصبائیں یہ ہیں: مثلاً سنسکرت بھاشا، ہندو قوم کا اتہاس (تاریخ)، ہندو تہوار۔ ہندی مہا پرشوں کا سمرن (ہندو سورماؤں کا تذکرہ)، ہندو دیش کے لیے یعنی بھارت یا ہندوؤں کے ستھان (ملک) کا پریم، ہندو قوم کی ساہتیہ (تحفظ) کا پریم وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ آج کل نیم عربی، نیم ایرانی مسلمانوں کو قومی تحریک میں خواہ مخواہ شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس صداقت کو نہیں سمجھتے کہ ہر ایک قومی ریاست پرانی منصبتاؤں پر قائم کی جاتی ہے جن سے لوگوں میں یگانگت کا بھاؤ (رجحان) پیدا ہوتا ہے۔ آج کل کے ہندی مسلمان تو محض جملہ معترضہ ہیں۔ ان کا یہی مستقبل ہے کہ آہستہ آہستہ شدھی کے ذریعے دوبارہ ہندو قوم کے اندر شامل ہو جائیں۔ راج نیتی شاستر (ضابطہ سیاست) کے مطابق مجھے کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا۔

(ملاپ ۵ فروری ۱۹۲۵ء)

انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں جو اخبار تیج کی ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ لکھا تھا:-

ہندو سنگھٹن کے لئے ہندو سوراجیہ (حکومت) کا آدرش (نصب العین) ضروری ہے۔ پنجاب میں ہندو سوراجیہ قائم کرنے کے لئے آدرش ہی سے لوگوں میں قربانی کی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہندو سنگھٹن کا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ جب تک ہندوستان بالخصوص پنجاب بدیشی مذہبوں سے پاک نہیں ہوگا ہمیں کبھی چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش کو نہیں مانتا وہ کپوت ہے، بے جان ہے، مردہ دل ہے، بے سمجھ ہے۔ اس لیے ہندوؤں کو مزید مشتعل کرنے کے لئے لکھا: "پنجاب اور ہندوستان میں دو قومیں نہیں رہ سکتیں۔ یا سب ہندو اسلام قبول کر لیں یا سب مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو بنا لو۔ یہی اس سوال کا حل ہے۔ مذہب اسلام ایک ایسی انوکھی چیز ہے کہ مسلمان کسی ملک میں دوسری قوموں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ اتفاق اور امن کے لئے ضروری ہے کہ یا صرف اسلام ہو یا اسلام بالکل نہ ہو۔ بیس فیصد اسلام سے صرف بلوہ فساد ہوں گے۔ بیس فیصد اسلام کے روڑے کو کوئی ملک ہضم نہیں کر سکتا۔ جس ملک نے اس پتھر کو نگل لیا اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہے گا۔ پس اسلام کی تاریخ اور مزاج کو جان کر ہمیں ہندو اتحاد کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے۔ اب تو صرف ذاتی طور پر شدھی کرنی چاہیئے سوراج ملنے پر ریاست کی مدد سے شدھی کی تحریک کو ترقی دینی چاہیئے۔"

لالہ ہردیال اپنی اس تحریک کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ افغانستان کو بھی ہندو دائرے کے اندر سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا:-

افغانستان کوئی جدا ملک نہیں۔ یہ ہندوستان، پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ افغانستان میں ہماری مورتیاں، بت اور مندروں کے کھنڈرات آج تک پائے جاتے ہیں جب تک افغان اور سرحدی قبائل کے مسلمان بھی ہندو قوم میں شامل نہیں کئے جائیں گے، اس وقت تک ہمارے ملک کی حفاظت کا پورا پورا انتظام نہیں ہو سکتا۔ تاریخ ہند سے ظاہر ہے کہ ان پہاڑی علاقوں سے ہم کو بہت

دُکھ پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس دُکھ کا اندیشہ صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ بہادر لوگ اسلام کے پیرو اور مسلمان ہیں۔ مگر جب ہم ان کو ہندو بنالیں گے تو یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ لہٰذا افغان اور سرحدی مسلمانوں کو ہندو بنا دینا ہمارا بہت ضروری فرض ہے۔ تمام ہندو قوم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ہندو کے سامنے یہ تین اصول ہر وقت رہنے ضروری ہیں۔ ایک تو ہندو سوراج، دوسرے ہندوستان کے سب مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانا، تیسرے افغانستان اور سرحد کو ختم کرنا اور وہاں کے باشندوں کو ہندو بنانا۔

اس کے بعد وہ افغانستان سے بھی آگے بڑھے اور کہا کہ

جب ہندو قوم میں پورا پورا جوش پیدا ہو جائے گا تو سوراج، شدھی اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم مشرقی افریقہ، فجی اور دوسرے ملکوں پر بھی قابض ہو جائیں جہاں ہندو بھائی آباد ہیں کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو غلامی کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے۔ پس ہندوستان کو اگر کبھی آزادی ملے گی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا بلکہ مسلمانوں کی شدھی، افغانستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش بھی پورے ہو جائیں گے۔ (اخبار ملاپ۔ ۱۳ر جون ۱۹۲۵ء)

اُسی زمانے میں ہندوؤں کے ایک اور مشہور لیڈر سوامی ستیہ دیو نے اپنی ایک تقریر میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو ہم مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھیں گے :-

(۱) —— قرآن کو الہامی کتاب مت مانو۔
(۲) —— محمدؐ کو خدا کا نبی مت مانو۔ (معاذ اللہ)
(۳) —— مکہ کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھو۔
(۴) —— سعدیؒ اور رومیؒ کی بجائے کبیر اور تلسی داس کو پڑھو۔
(۵) —— اسلامی تقریبات کی بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔
(۶) —— وہ تمام تقریبات مناؤ جن کا تعلق رام کرشن اور دوسرے دیوتاؤں سے ہے۔

(اخبار وکیل۔ امرتسر۔ ۹ دسمبر ۱۹۲۵ء)

اور پروفیسر رام دیو نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا :-

۔ ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

(گرو گھنٹال۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۶ء)

یہ تھے ہندو کے وہ عزائم جن کے علی الرغم ہندوستان میں تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوا۔ آپ سوچیے کہ جس قوم کے یہ عزائم ہوں وہ اس تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں کس طرح برداشت کر سکتی تھی؟ وہاں کے لیڈروں نے ایک طرف تو بساطِ سیاست پر اس کی مخالفت شروع کی اور دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف فسادات کا آغاز کر دیا۔ ان فسادات میں مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا، اس کی تفصیل طول و طویل ہے۔ (مسلم لیگ

کی طرف سے متعین کردہ پیر پور کمیٹی کی رپورٹ اس پر شاہد تھی)۔ میں اس مقام پر صرف ایک واقعہ کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ ۱۹۳۸ء میں سی۔ پی کے قصبہ چاندور میں، ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کو بُری طرح سے قتل کیا اور لوٹا۔ اور وہاں کی کانگریسی حکومت نے، خود مسلمانوں کو گرفتار کر کے انہیں جیل میں ٹھونس دیا۔ اس سلسلہ میں ان پر کس قدر تشدد کیا گیا اس کے متعلق،

مسلمانوں کا قتلِ عام

وہاں کے سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا:۔

> تمام مسلمانوں کی ذلت کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر تشہیر کی گئی۔ اور پھر سکول کے ایک کمرے میں ۱۴۵ مسلمان بند کر دیئے گئے۔ یہ کمرہ تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا جس میں یہ مسلمان رات بھر مقفل رکھے گئے۔ ان لوگوں کی تشہیر کے لئے جب انہیں سڑکوں پر گھمایا گیا تو وہ دوپہر کا وقت تھا اور چونکہ یہ سخت ترین گرمی کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت گرمی یقیناً زیادہ ہوگی۔ جو مجسٹریٹ، اس تشہیر کے وقت ساتھ تھا اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس وقت اتنی شدید گرمی تھی کہ اس تشہیر میں کئی لوگوں کو قے آ گئی ․․․․ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ذلت کے ساتھ بر سرِ عام کھڑا کر کے ان کی جانچ کرنے سے لے کر ۱۴۵ آدمیوں کو ان کے جیل بھیجنے کے وقت تک پولیس کا جو عمل رہا ہے اسے دیکھ کر آج کل کے نازی جرمنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔
>
> (مدینہ۔ یکم ۲۵۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۴۰ء)

یہ تھا کانگریس حکومت کے تحت مسلمانوں کی اقلیت کا حشر!

کہا یہ جاتا ہے ــــ اور خود اُس زمانے کے مسلمان نیشنلسٹ، جو حصولِ پاکستان کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے، کہا کرتے تھے ــــ کہ ہندو، وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا، جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خود مغربی جمہوریت ہی کس قدر ملعون و مردود نظامِ مملکت ہے، اگر مغربی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، تو ہندوستان کی جمہوریت بھی نرالے قسم کی ہوتی ــــ اور ہے ــــ مغربی اندازِ جمہوریت میں ہوتا یہ ہے کہ جو پارٹی آج اقلیت میں ہے اس کے لئے امکان ہے کہ وہ کل کو اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کر لے لیکن ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اور چونکہ یہ اقلیت مذہب کی بنیاد پر تھی، اس لئے اس کے لئے اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ یہ کبھی اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کر سکے۔ لہٰذا، اسے مستقلاً ہندو اکثریت کی محکومی کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ ہندو کی محکومی کس قسم کی ہوتی، اس کا جواب ہم سے نہیں خود وہاں کے اربابِ سیاست کی زبان سے سُنئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، اس ضمن میں لکھا تھا کہ

جمہوری نظام

> دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر، اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔　　(میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۵۵)

اس اکثریت کی حکومت کے تابع مسلمانوں پر کیا گزرتی، اس کے متعلق، متحدہ قومیت کی سب سے بڑی موید جمعیت علماء

جمعیت العلماء ہند — کے سیکرٹری مولانا احمد سعید (مرحوم) نے ۱۹۲۳ء میں کہا تھا کہ
اسلامی حکومت کے زوال پر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا — جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے، حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی۔

(الجمعیۃ - بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء)

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ۱۹۲۸ء میں مولانا شوکت علی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا:-

چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں؛ اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ "یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے"؛ جو مظالم آئے دن یہاں دفتروں میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں۔ اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے، ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے اہلِ وطن کے ساتھ متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔

(طلوعِ اسلام - بابت اپریل ۱۹۴۲ء)

ہندوؤں کے عزائم

انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف، قائد اعظمؒ نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا:-

ساورکر (صدر ہندو مہاسبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصہ مل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں۔ ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

(تقاریر قائد اعظمؒ - جلد اوّل - ص ۲۵۶-۲۵۵)

یہ تھا وہ ہندو جس کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے، ملتِ اسلامیہ کے محسنِ اعظم محمد علی جناحؒ نے دس سال تک مسلسل لڑائی لڑی اور ہندو اور انگریزوں کے علاوہ، خود نیشنلسٹ مسلمانوں کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، پاکستان حاصل کر لیا۔ اس پر ہندوؤں

پاکستان بن جانے کے بعد

کے دلوں کے اضطراب کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک طرف، ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی یہ کہہ رہا تھا کہ

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے

ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔　(آرگنائزر ص ۲)

دوسری طرف، دیوان چمن لال جیسے انظاہر اعتدال پسند ہندو) یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہے تھے کہ

میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم (اپنی قوم کو) امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔　(ایضاً)

اور تو اور، جب تقسیم ہند کا بل منظوری کے لئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ اٹیلی (جو اس وقت میجر اٹیلی تھے) اپنی تقریر میں فرما رہے تھے کہ

ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

پاکستان ——— انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس سمجھوتہ کے ایک فریق (انگریز) کے خیالات سن لئے۔ اب کانگریس کی سنیئے۔ ۳۔جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا، اور ۱۴، ۱۵ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا:-

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل، صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا

کانگریس کی طرف سے تقسیم ہند کے فیصلہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(پاکستان فیسز انڈیا۔ ص ۹۹)

اس کے بعد راجہ مہندر پرتاپ نے (۱۹۵۰ء میں) اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

(ویر بھارت۔ ۱۲/۹)

سوشلسٹ اپنے آپ کو بڑا منصف مزاج اور تعصب سے بالاتر قرار دیا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مخالفت کا تعلق ہے، اس میں ہندو مہاسبھا اور سوشلسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اس پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا کہ

> ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حد فاصل مٹ جائیگی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس انتظار میں ہوں گے کہ اس باب میں "بڑے میاں" (مسٹر گاندھی) نے کیا دیا کہاں دیا ہے۔ وہ بھی سن لیجئے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے تین دن پہلے کہا تھا کہ

> اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے، ہم پھر بھی مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزور شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔ (دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۱۹۱۔ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لوبی)

یہ اس داستان کا پہلا باب ہے۔ اب دوسرا باب ملاحظہ فرمایئے کہ تشکیل پاکستان کے بعد ہندو کس روپ میں سامنے آیا۔ اس روپ کے دو حصے ہیں: ایک یہ کہ ہندو نے خود اپنے ہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا اور دوسرے یہ کہ پاکستان کی طرف آنے والے مسلمانوں کو کس طرح اپنی ہوس خون آشامی کی تسکین کا سامان بنایا۔

باب دوم

(تشکیل پاکستان کے بعد)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء (بروز جمعۃ الوداع) ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ مملکتوں کا وجود عمل میں آیا اور اس کے دو روز بعد مسلمانوں نے آزادی کی فضا میں پہلی عید منائی۔ لیکن ہنوز نماز عید کی تکبیریں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں — نابھ، پٹیالہ، کپورتھلہ، فریدکوٹ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتل عام کی خبریں آنی شروع ہو گئیں۔

مسلمانوں کا قتل عام

اس قتل و غارت گری میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بچوں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالا گیا۔ عصمت دری کے واقعات عام ہونے لگے۔ بعض شہروں میں، مردوں کو ختم کر کے، نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت گری کی اس آگ کا رُخ دہلی کی طرف پھرا اور ہندوستان کے دارالسلطنت میں پورا ستمبر کا مہینہ اس قسم کے قتل عام میں گزرا جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس خونی تماشہ میں بھارت میں قریب دس لاکھ مسلمان قتل و غارت گری کی نذر ہو گئے۔ اور قریب

ایک کروڑ مسلمان، انتہائی کسمپرسی کے عالم میں کسی نہ کسی طرح، جان بچا کر پاکستان پہنچ پائے۔ ان تارکین وطن کے ساتھ راستے میں کیا گزری، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ضلع انبالہ کے کرالیا کیمپ سے پانچ ہزار پناہ گزینوں کا قافلہ لائل پور (حالیہ فیصل آباد) کے قریب پہنچا۔ ان میں سے دو ہزار مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ان میں ہیضہ کا مرض عام تھا۔ اس کیمپ میں انہیں جو آٹا کھانے کو دیا جاتا تھا، جب اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا گیا تو اس میں نیلا تھوتھا کا زہر ملا ہوا تھا۔ ایک گاڑی ۱۱ نومبر کو دہلی سے لاہور پہنچی تو اس میں سفر کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں نے بتایا کہ حکومت ہند نے جو سپاہی ان کی حفاظت کے لئے گاڑی میں متعین کئے تھے، انہوں نے کس طرح راستے میں ان کی عصمت دری کی۔ ایک ٹرین میں قریب ڈیڑھ ہزار پناہ گزین دہلی سے آ رہے تھے۔ امرتسر کے قریب ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کی طرف سے وہاں سے آنے والے مسلمانوں کے خلاف ہو رہا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے کیا واویلا مچایا جا رہا تھا۔ ان کی طرف سے مسلسل چیخ و پکار ہو رہی تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ان کے گھر لوٹ لئے ہیں، ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واویلا جس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد مہاتما گاندھی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کی اپنی شام کی پرارتھنا کی میٹنگ میں کہا تھا کہ

> اگرچہ میں نے جنگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اگر اس سلسلہ میں پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریق کارگر نہ ہوا تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان، پاکستان کے خلاف جنگ کرے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ "میں چاہتا تھا کہ اپنی فوجیں پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجوں لیکن ہندوستان کے اندرونی خلفشار نے اس کی اجازت نہ دی"۔

یہ تھا ہندو لیڈروں کی طرف سے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے والے قیامت خیز واقعات کا جواب!

خدا خدا کر کے کسی نہ کسی طرح یہ آگ فرو ہوئی تو ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات شروع کرا دیئے گئے جس کے نتیجہ میں قریب ڈیڑھ لاکھ مسلمان، اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر نہایت کسمپرسی کی حالت میں، مشرقی بنگال کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سمت میں آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ ہندو نے پاکستان کے خلاف اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں کیا کیا، ہمیں پیچھے مڑ کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے خود ہندوستان میں "اپنی قوم" کے افراد (مسلمانوں) کے ساتھ کیا کیا۔

ہندوؤں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد، پہلا کام یہ کیا کہ سومنات کی جامع مسجد کو، جو ۱۲ سو سال سے وہاں ایستادہ تھی، مسمار کر کے اس کی جگہ مندر بنا دیا۔ یہ تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئی اور اس "مقدس رسم" کی ادائیگی کے لئے، سیکولر حکومت کے صدر، بابو راجندر پرشاد کو بلایا گیا۔ اس کے

ٹ۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم (پاکستان کے مسلمانوں) نے اس کا جواب کیسے دیا تھا؟ یہ تقریب ۱۱ مئی کو منعقد ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۱ مئی کو قوم میں جس قدر لڑکے پیدا ہوں ان کا نام محمود رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا کرنے سے ہم خوش ہو گئے کہ ہماری قوم میں اتنے محمود پیدا ہو گئے ہیں۔ کس قدر خود فریب واقع ہوئے ہیں ہم؟

بعد جو دہلی کی مسجدیں ڈھانے کی طرح پڑی ہے تو پھر ایسے واقعات کا کوئی انت شمار ہی نہیں رہا۔ حالانکہ تقسیم ملک سے متعلق آئین میں، اقلیتوں کے مذہب اور ثقافت کی حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی۔ اخبار مدینہ کی ۲۸ جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اُس وقت تک ایک شہر لدھیانہ کی ۱۱۷ مساجد میں سے ۹۰ میں گردوارے بن چکے تھے۔ ۱۵ میں مندر۔ اور باقیوں میں رہائش۔ (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۶ء)

اسلامک کلچر کا خاتمہ

جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے۔ ہندوستان کے پہلے جشن آزادی کی تقریب پر یو۔پی کانگریس کمیٹی کے صدر اور وہاں کی اسمبلی کے سپیکر، مسٹر ٹنڈن نے پورے جوش و خروش سے کہا کہ

> ہندوستان یونین میں، جداگانہ زبان اور جداگانہ کلچر کی آواز کہیں سے نہیں نکلنی چاہیئے۔ جو لوگ کسی خاص فرقے کے لئے جداگانہ زبان یا کلچر کی حمایت کرتے ہوں، ان کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنا نظریہ بدل سکیں تو انہیں ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔ مذہب اور کلچر دو مختلف چیزیں ہیں۔ چین جاپان اور دیگر ممالک میں بھی مسلمان بستے ہیں، نہ ان کی جداگانہ زبان ہے نہ جداگانہ کلچر۔ ان کا کلچر وہی ہے جو ان کی مادرِ وطن کا کلچر ہے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنے کے خواہش مند ہیں تو انہیں ہندی کو بطور زبان اور ناگری کو بطور رسم الخط اختیار کرنا ہوگا۔ انہیں اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے عرب یا پاکستان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ بھارت ورش کے کلچر کو اپنا کلچر بنانا چاہیئے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء)

سی۔پی کے وزیر اعظم، مسٹر شکلا نے بھی یہی کچھ فرمایا اور کہا کہ

> میں ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں ابھی تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ ہی کامیاب ہونے دیں گے۔ (ملاپ۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۸ء)

اور انڈین پارلیمنٹ کے سپیکر، مسٹر موالنکر نے ایک جلسہ میں کہا کہ

> ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدّن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدّن کو تباہ ہو جانا چاہیئے ..... اقلیت کے فرقہ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔
>
> (الجمعیتہ، دہلی۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت فروری ۱۹۵۰ء)

جب مسلمانوں نے ہندوؤں کے معتدل مزاج لیڈروں کی توجہ ان تقاریر کی طرف دلائی تو پنڈت سندر لال جیسے لیڈر نے، جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو ایک طرح کا مسلمان کہا کرتے تھے، جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے کہا کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوتی ہے تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کڑوا گھونٹ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔ آخر تمہیں میں سے وہ لوگ تھے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بٹ

کے رہے گا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ (صدق۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۸ء)

یہ ۱۹۴۸ء کی باتیں تھیں۔ اور ۱۹۶۷ء میں ہندو مہا سبھا نے الیکشن کے سلسلہ میں جو اپنا منشور شائع کیا، اس میں واضح الفاظ میں لکھا کہ

> مہا سبھا، دستور میں اس قسم کی ترمیمات کے حق میں ہے جو ہندو کلچر کی روایات کے مطابق ہوں اور جس کے نتیجے میں ملک صحیح معنوں میں ایک جمہوری ہندو ریاست بن سکے۔ اگرچہ اقلیتیں کلچر اور مذہب کے معاملہ میں آزاد ہوں گی لیکن انہیں ہندو قومیت کے خاص دھارے میں سمو جانا چاہیئے اور مذہب اور کلچر کے نام پر علیحدہ قومیت کے تصور کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔
>
> ("مدینہ" بجنور - ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

یہ کچھ وہاں موجود مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جہاں تک وہاں کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کا تعلق ہے، ان کے لئے نظام تعلیم ایسا وضع کر دیا گیا جس سے وہ بھول جائیں کہ وہ کسی جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ (یہی مسٹر گاندھی کی واردھا کی تعلیمی سکیم کا مقصد تھا)۔ اس سلسلہ میں ۱۹۶۶ء میں مولانا ابوالحسن ندوی نے ہندوستان میں رہنے والے اپنے ایمانی بھائیوں کے نام ایک اپیل میں کہا تھا کہ

> دل پہ پتھر رکھ کر لیکن آنکھوں کی پٹی کھول کر یہ بات عرض کرنی پڑتی ہے کہ اب اس بات کے سمجھنے میں کسی دور بینی یا فراست ایمانی کی ضرورت نہیں کہ سرکاری سکولوں میں جو نصاب (بالخصوص ہندی اور سنسکرت میں) پڑھایا جاتا ہے اس کے بعد کسی مسلمان بچے کا، کم سے کم معنی میں بھی مسلمان رہنا عقلاً اسی طرح ممکن نہیں جیسے دریا میں کودنے اور غوطہ لگانے کے بعد جسم کا خشک رہنا اور دامن کا تر نہ ہونا، ممکن نہیں۔ (طلوع اسلام۔ نومبر ۱۹۶۶ء)

یہ کچھ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں متواتر تئیس سال[1] سے جو

فسادات

فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور جن میں مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت کچھ بھی محفوظ نہیں رہتی، ان کا حد و شمار ہی نہیں۔ سید بدرالدجیٰ، مغربی بنگال کے ایک مسلم راہنما ہیں۔ بہت پرانے کانگریسی۔ آزادی کی جنگ میں ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈروں کے ہمراہ لاٹھیاں کھانے والے اور جیل جانے والے۔ (۱۹۶۷ء میں) وہ وہاں کی مرکزی پارلیمان کے رکن تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ پارلیمان کے بھرے اجلاس میں ایک طویل تقریر کی جس سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کو حاصل کئے انیس سال ہو گئے ہیں۔ ان انیس سالوں میں (مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے) پولیس کی بے امتیازانہ فائرنگ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ روایات کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری، چھوٹی چھوٹی بستیوں کا صفایا، لوٹ مار کے دل دوز مناظر، ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام، بلاکسی امتیاز کے لاکھوں کی گرفتاریاں، آسام اور مغربی بنگال سے بے دخلیاں اور اس قسم کے دوسرے ہزارہا واقعات مسلمانوں سے موجودہ سیکولر حکومت

---

[1] اسے ذہن میں رکھئے کہ یہ خطاب پہلے ۱۹۶۶ء میں اور پھر مئی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔

کے "جانبدارانہ" سلوک کے ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں انکشاف کیا کہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دے کر غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مغربی بنگال میں ۴۵ ہزار پاکستانی موجود تھے۔ ان میں سے دس ہزار نظر بند کر لئے گئے جو مسلمان تھے۔ ہندوؤں کو پاکستانی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کہا گیا۔ (طلوع اسلام۔ جولائی ۱۹۶۶ء)

واضح رہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ حالت، ہندوؤں کی حکومت کے دس بیس سال بعد جا کر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا آغاز تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ اس کی ایک خفیف سی جھلک طلوع اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۴۹ء میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں:-

> میں مسٹر۔۔۔۔ کی تجویز سے اختلاف کرتا ہوں۔۔۔ ہندوستان سے "ہندو اور مسلمان" قسم کے الفاظ یکسر نابود کر دینے چاہئیں۔ یہ تفریق، ترقی کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ جونہی ہم نے محسوس کر لیا کہ ہم (فقط) "ہندوستانی" ہیں، موجودہ تصادم کی جگہ خوشحالی اور خیر سگالی آ جائے گی۔
>
> (مسٹر ایم ایس ایچ قریشی کا خط جو ۳۰ رنومبر ۱۹۴۸ء کے سٹیٹسمین میں شائع ہوا)

اس خط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پہ کیا گذر رہی تھی!

> یہاں کے مسلمان اگر انڈین یونین کے وفادار رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ ہندی کو اپنائیں اور ہندوستان کی تہذیب اختیار کریں۔ اُن کے اپنے تمدن اور زبان کی اب ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ صوبہ متحدہ کے صدر کانگریس اور صوبہ اسمبلی کے اسپیکر راج ٹنڈن جی نے اپنی لکھنؤ اور دہلی کی تقریروں میں بار بار فرمایا اور بیا وہ فرماتے ہی رہتے ہیں۔ بھولے بھالے مسلمان اب جا کر سمجھے کہ اُن کا اطمینانِ قلب قبل از وقت تھا، جب وہ واقعۂ حیدر آباد کے بعد پنت جی وزیر اعظم یوپی کی زبان سے یہ سن کر خوش ہو گئے تھے کہ "اب مسلمانوں سے وفاداری کے کسی مزید مطالبہ کی ضرورت نہیں"۔ ابھی تو اپنا تمدن چھوڑنے اور اپنی زبان ترک کرنے کے مطالبات باقی ہیں!

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ایسی تقریریں "گاندھی جی کے یوم پیدائش کے موقع پر" عین ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں۔ (صدق، لکھنؤ ۳ر دسمبر ۱۹۴۸ء)

معاصر الجمعیت دہلی کے صفحات میں ایک مراسلہ:-

> جیسا کہ اندیشہ تھا آخر وہ گھڑی آ کر ہی رہی اور کل راجستھان یونین کا حکم آ گیا کہ ٹونک کے محکمۂ شریعت کو ختم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک انفرادی اور اجتماعی جو کوشش کی گئی تھی اور جمعیت العلمائے ہند نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا افسوس وہ بے سود رہا۔ ان چھ ماہ میں تعطیلِ جمعہ اور اسلامی تعطیلات کی منسوخی، ذبیحہ گاؤ کی بندش اور بہت سے ملازموں کی برطرفی اور اردو کی جگہ ہندی کو مسلمان پورے صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ لیکن اب محکمۂ شریعت کے خاتمہ نے ان کو حد سے زیادہ روحانی تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔

نئی دہلی ۲۰ دسمبر۔ آج دستوری اسمبلی میں جب حقوقِ مذہب زیرِ بحث تھے تو ایک ممبر مسٹر تجمل حسین نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی کہ آئندہ سے اس ملک میں کوئی شخص نہ ایسا لباس پہنے، نہ ایسا نام رکھے نہ ایسی وضع قطع اختیار کرے جس سے اس کے مذہب کا پتہ چل سکے۔ (خبر)

یہ صرف اتنا کر لیجئے کہ اس تجویز کے اس "دو قومی نظریہ" کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والی تجویز کے پیش کرنے والے کوئی غیر مسلم نہیں۔ ایک ہندی مسلمان، صوبہ بہار کے مسلمان ہی تھے! ــــــ خدا معلوم توجہ عالی صرف نام، وضع و لباس ہی تک کیوں رہی؟ کیوں نہ ارشاد ہو گیا کہ اپنے کو سرے سے کسی مذہب سے منسوب کرنے ہی کا شمار غداری میں ہوگا۔ (صدق ۱۷ دسمبر ۱۹۴۷ء)

ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں اب تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ کامیاب ہونے دیں گے۔ مسلمان بھائی یا دوسرے لوگ اگر اس دیس میں رہنا چاہتے ہیں تو انہیں ہندی کو راشٹر بھاشا بنانا ہوگا۔ انگریز کے راج میں جو اختلاف تھا ہم اسے باقی نہیں رہنے دیں گے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ پرانی باتوں کو بھول جائیں اور یہ محسوس کریں کہ انہیں نہ صرف اس دیس کی زبان بولنی ہوگی بلکہ جس طرح اس دیس کے لوگ رہتے ہیں اسی طرح رہنا ہوگا۔ متضاد اور مخالف تہذیبوں کے لئے ہمارے دیس میں اب کوئی جگہ نہیں۔

(مسٹر شکلا، وزیر اعظم سی۔پی، بحوالہ ملاپ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۸ء)

یہ تمام اقتباسات طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئے تھے۔

یہ ہو گئی تھی ہندی مسلمانوں کی حالت تقسیمِ ہند کے فوری بعد۔

جہاں تک فسادات کا تعلق ہے ان کی کیفیت بڑی دلدوز اور جگر سوز ہے۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار (NOW) کی ۱۲ جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کہا گیا تھا:

"تقسیمِ ہند کے بعد کم از کم پانچ سو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں جن میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زائد ہے۔ لیکن یہ تخمینہ بہت پرانا ہے اور نظرِ ثانی کا محتاج۔ یہ تمام فسادات سیکولرازم کے پردے میں ہوئے ہیں اور یہ سیکولرازم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس برہمن ذہنیت کی حفاظت کی جائے جس کی نمائندگی جن سنگھ اور آر۔ایس۔ایس جیسی فاشسٹ جماعتیں کر رہی ہیں۔ بظاہر یہی جن سنگھ فسادات کراتی ہے لیکن پس پردہ اس کو کانگریس کی پوری تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر نراد سی۔ چودھری لکھتا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ ہندو روایت جس قدر متشدد آج ہے اتنی آزادی کے وقت نہ تھی۔ اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اس میں مسلمانوں کے بارے میں اور بھی زیادہ شدت آ رہی ہے۔"

(بحوالہ ایشیا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۶۸ء)

۱۹۶۸ء میں بھارت کے وزیر داخلہ نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا تھا کہ ملک کے مختلف حصوں میں جو فسادات ہوئے ہیں، ان کی تعداد ۱۹۶۶ء میں (۱۳۲) اور ۱۹۶۷ء میں (۲۰۹) تھی۔ ۱۹۶۸ء میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کے صرف چار ماہ میں مسلمانوں کے خلاف (۱۰۳) فسادات ہو چکے ہیں۔ خونریزی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۶۶-۱۹۶۵ء تک مقتولین کی تعداد کا جو اوسط تھا، ۱۹۶۷ء کے صرف پہلے ۹ ماہ میں مقتولین کی تعداد اس سے دگنی ہو چکی تھی۔ (بحوالہ ایشیا ۱۲ جولائی ۱۹۶۸ء)

فسادات کی لرزہ انگیز تفصیلات

اوائل ۱۹۷۱ء میں راولپنڈی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار جریدہ ہلال میں ایک صاحب این۔ بی۔ نقوی کا ایک مبسوط مقالہ متعدد اقساط میں شائع ہوا تھا جس میں ان خون ریزیوں اور فساد انگیزیوں کی الم انگیز داستانیں تفصیل سے بیان کی گئی تھیں جو تقسیم ہند کے بعد، ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف برپا ہوئیں۔ یہ مضمون ایک انگریزی پمفلٹ کا ترجمہ تھا جسے معارف لمیٹڈ کراچی نے شائع کیا تھا۔ ہم اس حقیقت کشا مقالہ کے جستہ جستہ مقامات درج ذیل کرتے ہیں:-

(۱) "بھارتی لوک سبھا کے ایک رکن اسحاق سنبھلی کے مطابق ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۷ء کے آخر تک بھارت میں ساڑھے سات ہزار مسلم کش فسادات ہوئے یعنی بھارت نے اپنی آزادی ہی کے دن سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر اپنی 'آزادی' کی ابتداء کی تھی۔ بھارت کی وزارتِ داخلہ کی ایک سالانہ رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۵ء میں ملک بھر میں تین سو چھیالیس فسادات ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر پانچ سو تین تک پہنچ گئی۔ ہزارہا مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس خونِ ناحق پر ایک ممتاز بھارتی ممبر ایس مل گاڈگل یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ "اس سال فرقہ وارانہ کشمکش کے سیاہ ترین بارہ ماہ گزرے۔" مسلم کش فسادات کی رفتار یہ ہے کہ لوک سبھا کے ایک ممبر جیوتر موئی باسو کے مطابق ہر چھتیس گھنٹے بعد بھارت میں ایک فرقہ وارانہ فساد رونما ہوتا تھا۔

حالیہ برسوں میں بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں ہونے والے فسادات کا ماحصل مسلمانوں کو قتل کرنے کے علاوہ ان کے مال اسباب کا لوٹنا اور ان کی جائیدادوں کو آگ لگانا رہا ہے۔ اب ہر سن اور ہر شہر کی مثالیں گنتے چلئے:- جبل پور (۱۹۶۱ء) کلکتہ، جمشید پور اور روڑکیلا (۱۹۶۴ء) رانچی اور سرسند (۱۹۶۷ء) اندور اور احمد آباد (۱۹۶۹ء) اور بھوانڈی اور مہاراشٹر کا پورا صوبہ (۱۹۷۰ء)۔ تشدد کے ان تمام واقعات کی بنیادی بات یہی رہی کہ ـــــ خونِ مسلم کی ارزانی ہوئی۔ ان کا مال و اسباب لوٹا گیا ـــــ اور ان کی جائیدادوں کو آگ لگا کر تباہ کیا گیا ـــــ اور دوسری خاص بات یہ ہے کہ بھارت کا قانون حسبِ دستور اندھا بنا رہا۔ اس نے کسی ہندو مجرم کو بیڑیاں پہنا کر دار و رسن تک نہ پہنچایا۔"

(۲) "ہندوستان ٹائمز" کا نامہ نگار سبرتا بینرجی فسادات کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں یکم نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے: "ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، میں حیران ہوں کہ لوگوں کا وہ محدود طبقہ جو نسلی فسادات کے خلاف ہے، اس سے تجاہلِ عارفانہ سے کام کیوں لے رہا ہے۔ میں احمد آباد سے یہ تاثر لے کر لوٹا

ہوں کہ وہاں جو کچھ ہوا ہے اس کا مقابلہ بآسانی ہٹلر کے جرمنی کے ان منصوبوں سے ہو سکتا ہے جو یہودیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ یا امریکہ کے انتہائی جنوبی علاقے میں جن طریقوں سے سیاہ فام لوگوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔"

بھارتی ہندو، مسلم کش فساد کی تیاری کس طرح کرتے ہیں اور مسلمانوں کے قتلِ عام اور لوٹ مار کے منصوبے پر کس طرح عملدرآمد کرتے ہیں، اس کا جواب ذیل کے اقتباس سے مل جائے گا جو نئی دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ "لنک" کے ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء کے شمارے میں چھپنے والے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔

"مسلمانوں کے قتلِ عام کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو بھی ہے۔ امرت ناتھ نے جسے حکمران جماعت کانگریس نے تحقیق و تفتیش کے لئے مقرر کیا تھا، الہ آباد کے واقعات کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ چاقو زنی کی وارداتیں اس وقت شروع ہوئیں جب افواہوں کے ذریعے پھیلنے والا لوگوں کا پاگل پن ٹھنڈا پڑ چکا تھا چنانچہ بیس آدمی جن پہ چاقو سے حملہ کیا گیا وہ تمام نہ صرف مسلمان تھے بلکہ سوائے ایک دو کے ان سب کو کسی ایک خفیہ شخص نے اپنا نشانہ بنایا تھا۔ ہر مضروب کے معدے میں اس طرح چاقو گھونپا گیا تھا کہ یا تو اس کی نوک پھیپھڑوں تک یا دل تک پہنچ جائے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کی چاقو زنی باقاعدہ تربیت یافتہ آدمیوں ہی کا کام تھا۔ رانچی، میرٹھ اور کلکتہ میں ہونے والی وارداتوں سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

منظم طریق

(۳) ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار سُبرتا بینرجی نے رانچی، کرشنگر، ناگپور، جبل پور، اندور، اورنگ آباد، احمد آباد کے علاوہ بھاگلپور اور کلکتہ کے حالیہ فسادات کے بارے میں اپنی ایک رپورٹ میں لکھا:-

"ہر جگہ فسادات کا انداز ایک ہی رہا۔ لیکن بہانہ یہ نہیں تھا کہ ایسے ہی فسادات پاکستان میں بھی ہوئے ہیں بلکہ ہر مرتبہ بات کا بتنگڑ بنا کر قتل و غارت گری، آتشزنی اور لوٹ مار کی داستانیں دہرائی گئیں اور اس سلسلے میں سوچی سمجھی سکیموں اور منظم طریقوں پر عمل کیا گیا۔"

"بظاہر اتفاقیہ" واقعات جن کے متعلق خیال یہ ہے کہ ان کی وجہ سے احمد آباد میں فسادات کی آگ بھڑکی تھی، سُبرتا بینرجی نے اُن کے پس منظر سے پردہ اٹھایا اور اپنی رپورٹ میں لکھا ہے:-

"اس قسم کے واقعات یہاں ہر سال ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ فساد کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں کے ایک مندر سے کچھ ڈھور ڈنگر نکل کر مسلمانوں کے ایک عرس کی تقریب میں جا گھسے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد مبینہ طور پر تین سو آدمیوں کے ایک جتھہ نے جگن ناتھ مندر پر گیس کے بلبوں سے حملہ کر دیا۔ لیکن جب میں مندر دیکھنے گیا تو میرے تعجب کی حد نہ رہی۔ مندر کے صدر دروازے کے صرف تین شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ لیکن ان شیشوں کے پیچھے جو مُورت نصب تھی انہیں خراش تک نہ آئی تھی۔ تین سو افراد جو گیس کے بلبوں سے مسلح ہوں کچھ نہ کچھ نقصان تو کر ہی سکتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بات کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ تین سو حملہ آور مسلمان تھے یا کون تھے —— دوسری بات یہ ہے کہ مندر پر مبینہ حملے کے فوراً بعد وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مسلمان دھوبی کی دکان پر حملہ ہوا اور دکان تباہ کر دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر پر مبینہ

حملے کی خبر بہت ہی تیزی کے ساتھ پھیلی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جگن ناتھ مندر کے ساتھ والی بستی میں تشدّد کا ایک بھی واقعہ نہ ہوا۔ وہاں ہندو اور مسلمان فسادات کے پورے عرصے کے دوران پُرامن طور پر رہتے رہے۔"

اب مسٹر بنرجی ہی کی زبانی فسادات کی نوعیت کے بارے میں بھی سُن لیجئے۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے :-

"کہا یہ جاتا ہے کہ جگن ناتھ مندر کے واقعہ سے لوگوں کے ذہن مشتعل ہو گئے اور پھر وہی کچھ ہوا جو ایک ہجوم کی دیوانگی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک مشتعل ہجوم کی یہ نام نہاد دیوانگی ایک مخصوص اور منظم طریقے سے ظاہر ہوئی۔ مسلمانوں کے گھروں کا پتہ لگانے کے لئے انتخابی فہرستیں استعمال کی گئیں۔ اور پھر ان کے گھروں پر حملہ کرنے کے لئے وہاں مخصوص نشان لگا دیئے گئے۔ جب مسلمان دکانداروں پر حملہ کیا گیا تو اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اگر دکان کسی ہندو کی ملکیت ہے تو پھر صرف سامان لوٹا گیا، عمارت کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ لیکن اگر دکان کسی مسلمان کی ملکیت تھی اور دکاندار ہندو تھا، تو اس صورت میں دکاندار اور اس کے مال و اسباب کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا لیکن عمارت تباہ کر دی گئی —— یہ تھا ایک مشتعل ہجوم کا پاگل پن !

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ احمد آباد کے مشتعل ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملوں کے دوران جو ابتدائی قسم کی فوجی چالیں اور حربی طریقے اپنائے تو انہوں نے لاشعوری طور پر ایسا کیا۔ لیکن یہ بھی ایک بے بنیاد بات ہے۔ ایسے لوگ جو فوجی تربیت سے کوسوں دور ہوں، بلا سوچے سمجھے فوجی چالیں کیسے اپنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے قدم قدم پر بڑی عمدہ تنظیم اور تیز فہمی کا بھی ثبوت دیا۔

مسلمانوں کو احتیاط سے تلاش کرنے کے دوران ہندوؤں نے مشہور و معروف لوگوں پر خاص طور پر توجہ دی جن کے متعلق یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ فرقہ پرست یا غدار ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جناب غلام رسول قریشی پر متواتر حملوں کی کیا وجہ بیان کی جا سکتی ہے ؟

مشتعل ہندوؤں نے قتل و غارت گری کے جو طریقے اختیار کئے، ان کے بارے میں مسٹر بنرجی لکھتا ہے :-

"یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ مشتعل ہجوم نے اپنی دیوانگی کے باوجود اتنی سمجھداری سے کام لیا کہ اس نے کچھ صنعتی ادارے جو مسلمانوں کی ملکیت تھے، تباہ کر دیئے۔ چنانچہ یہ یقین کر لینا کہ یہ فسادات ایک عام دیوانگی کا "بے ساختہ" نتیجہ تھے، سراسر غلط ہوگا۔ پہلے سے کی گئی منصوبہ بندی، تربیت اور تنظیم کے بغیر یہ سب کام اور اتنے وسیع پیمانے پر کئے نہیں جا سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ احمد آباد کا پورا شہر مسلح ہندو فرقہ پرست جتھوں اعلیٰ راشٹریہ سیوک سنگھیوں کے ہاتھوں میں کئی روز تک رہا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ نہایت منظم اور باقاعدہ طریقے سے افواہیں پھیلائی گئیں۔ بلکہ یہ کام فسادات کے بعد بھی جاری رہا۔ معمولی واقعات کو اس طرح ہوا دی گئی کہ یہ ظاہر ہو سکے کہ مسلمان لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں۔ احمد آباد میں یہ افواہ زوروں پر تھی کہ شوراتری کے تہوار کے موقعہ پر مسلمانوں نے ہندوؤں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس بات کو سچا ثابت کرنے کے لئے اجمیر شریف کے عرس سے واپس آنے والے مسلمانوں کے ایک گروہ کو احمد آباد میں ٹرین سے اتار لیا گیا۔ اور ہندو فرقہ پرستوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کی سازش کو بے نقاب کر کے ناکام بنا دیا ہے۔"

فسادات کے پسِ پردہ تنظیم اور منصوبہ بندی کے بارے میں دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ

مین سٹریم (MAIN STREAM) نے اپنی ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں لکھا :-

"احمد آباد کے ہنگاموں کے طریقوں سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے کے فسادات کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے طریقے استعمال کئے جاتے تھے کہ کشیدگی بڑھے۔ اقلیتی فرقے کو پہلے وار کرنے پر اکسایا جائے۔ فسادات میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملوث کیا جائے۔ فسادیوں کے نزدیک یہ طریقہ وار کرنے کے ساتھ ساتھ دفاع کا بھی ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ہجوم جب منتشر ہو جاتا ہے تو فسادی لوگ وسیع علاقے میں چاقو زنی کی وارداتیں کرتے ہیں اور افراتفری میں ان کی یہ حرکت ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ انہیں چاقو زنی کی خاص تربیت ملی ہوتی ہے۔ زخموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وار اس طرح کئے گئے کہ زخم کھا کر مجروح بچنے نہ پائے۔ احمد آباد میں جو کشیدگی پائی جاتی ہے اس کے بڑھنے اور پھیلنے میں دو سال کا عرصہ لگا اور اس عرصے کے دوران پورے صوبہ گجرات میں بے شمار فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ مسجد الاقصیٰ پر اسرائیلیوں کی دراز دستی کے خلاف احمد آباد کے مسلمانوں نے جب احتجاجی جلوس نکالا تو یہ کشیدگی پھیلنے کا ایک اور بہانہ بنا۔ اس طرح کہ ایک چھوٹا سا واقعہ رونما ہوا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ اور چند سادھوؤں کے درمیان ایک جھڑپ ہو گئی۔ بس اسی بات کو پورے احمد آباد شہر میں فساد کی آگ لگانے کے لئے کافی بنا لیا گیا۔ شہر کے مہذب علاقے بھی نہیں چھوڑے گئے۔ مسلمانوں کے مکانوں کی پوری کی پوری قطاریں جلا دی گئیں۔ اور چاقو زنی کی بجائے سفاک فرقہ پرستوں نے یہ کیا کہ جلتے ہوئے مکانوں میں سے جو کوئی بھی جان بچانے کی خاطر بھاگ کر باہر آتا تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے آگ میں دوبارہ ڈال دیا جاتا۔ اسی طرح اِکّا دُکّا لوگوں کو چاقو مارنے کی بجائے ایک ہی دفعہ سب کو آگ میں زندہ جلا دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔"

(۴) ان فسادات سے قبل، ان کے دوران اور ان کے بعد مقامی حکام نے جو کردار ادا کیا، اس کی داستان

حکام کا کردار

بہت افسوسناک ہے۔ اس سلسلے میں احمد آباد کے فسادات کی مثال دی جاتی ہے۔ وہاں کے فسادات کے دوران پولیس نے جو کردار ادا کیا، اس کے بارے میں سبرتا بینرجی نے اپنی رپورٹ میں لکھا :-

"فساد زدہ علاقوں کے دورے کے دوران میں نے موگز کے فاصلے پر ایک مسجد دیکھی اور وہیں سے ایک تھانہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ مسجد تباہ ہو چکی تھی۔ پولیس کے رویئے کے بارے میں مجھے مختلف داستانیں سنائی گئیں کہ کس طرح اس نے مسلمانوں کو پناہ دینے والے لوگوں کو مار پیٹا۔ یہ کوئی نرالی بات نہ تھی کیونکہ پہلے بھی فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس ملوث رہ چکی ہے اور آج بھی مسلح پولیس اور سیکورٹی فورس کے لوگ جگن ناتھ مندر میں روزانہ آتے جاتے ہیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے سادھو انہیں فسادات کی انتہائی مبالغہ آمیز داستانیں سناتے ہیں۔ چنانچہ ان سے فرض کی ادائیگی اور مسلمانوں کے تحفظ کی توقع ہی فضول ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مندر کو پولیس اور سیکورٹی فورس والوں کے لئے خارج از حدود (آؤٹ آف باؤنڈ) قرار دیا جائے۔"

اگر نام نہاد فرقہ وارانہ فسادات کو منظم قتل و غارت گری کہا جائے تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتظامیہ اور بالخصوص پولیس اس دوران کیا کردار سرانجام دیتی ہے۔ مقامی حکام کے رویئے کے بارے میں دہلی سے شائع

ہونے والے انگریزی ہفت روزہ لنک (LINK) نے اپنی ۱۴ مارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں لکھا :-

" جب فسادات رونما ہوتے ہیں تو انتظامیہ سے متعلق افراد عموماً یہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک یکساں تعداد کو حالات و واقعات سے منہ موڑ کر گرفتار کر لیتے ہیں تاکہ دونوں فرقے برابر کے شریک سمجھے جائیں۔ کس نے کس پر حملہ کیا، کس نے کس کو قتل کیا یا لوٹا، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی —— یہی کچھ الہ آباد میں بھی ہوا —— !"

پارلیمنٹ کے ایک کانگرسی رکن امرت ناتھ نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو اپنی رپورٹ میں لکھا :-

" وہ ہندو جو ہولی کے موقع پر ضلع کے دور دراز علاقوں میں غیر فرقہ وارانہ فسادات کے دوران زخمی ہوئے انہیں بھی اُن مسلمانوں کے ساتھ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جنہیں شہر میں ہونے والے فسادات کے دوران چاقو مار کر زخمی کر دیا گیا تھا۔ ہندو اور مسلمان زخمیوں کو ساتھ ساتھ رکھنے کا مقصد یہ غلط تاثر پیدا کرنا تھا کہ دونوں فرقوں کا نقصان برابر رہا ——"

⑤ مختلف فرقہ وارانہ فسادات کے حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پس منظر میں کوئی ہمہ گیر پاگل پن نہ

کسی پر مقدمہ نہیں چلایا گیا

تھا، اور نہ عام لوگوں کا اُن میں ہاتھ تھا بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے مگر منظم گروہوں کی کارستانی تھی لیکن ان کا پتہ لگا کر انہیں بے اثر بنایا جا سکتا تھا۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہفت روزہ "لنک" نے اپنی رپورٹ میں لکھا :-

"لیکن حکام ان گروہوں کا پتہ لگانے میں ناکام رہے۔ آزادی کے بعد بیس برس کے عرصے میں جتنے فسادات ہوئے ان میں قتل و غارت گری کے الزام میں ایک بار بھی کسی بھی شخص کو گرفتار کر کے مقدمہ نہیں چلایا گیا، نہ سزائے موت دی گئی نہ عمر قید سنائی گئی ۔"

اس رسالے نے پولیس اور حکام کی جانبداری کی مثالیں دیتے ہوئے آگے چل کر پارلیمنٹ کے کانگرسی ممبر امرت ناتھ کی اس رپورٹ کا ایک حوالہ دیا ہے جو اس نے الہ آباد کے فسادات کے بارے میں لکھی تھی :-

" ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انہیں (پارلیمنٹ کے ممبروں کو) بتایا کہ ہلاک ہونے والے تین افراد میں سے دو مسلمان تھے۔ لیکن جب ممبروں نے مرنے والے غیر مسلم کا نام دریافت کیا تو اس موقع پر جتنے بھی پولیس افسر موجود تھے، سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور سرگوشیاں شروع کر دیں بالآخر ہمیں بتایا کہ وہ نام سے ناواقف ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ ہندو کی موت کی کہانی من گھڑت تھی ——"

⑥ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک فسادات کی تعداد بتدریج کم ہوتی رہی۔ لیکن بعد کے برسوں میں یہ

اعداد و شمار

آگ پھر بھڑکنے لگی۔ مرنے والوں کی تعداد، تباہ ہونے والی جائدادوں کی مالیت اور جن طریقوں سے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، اگر ان سب باتوں کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تشدد کے واقعات کی نہ صرف شدت بلکہ پھیلاؤ میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ صرف ۱۹۶۵ء میں جب کہ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہوئی، مسلم کش فسادات میں خاص کمی پیدا ہوئی۔ اس کی وجوہات اور تھیں۔ ۱۹۶۴ء میں فسادات اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ اس سال تشدد کے

ایک ہزار ایک سو ستر واقعات ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ تعداد کم ہو کر چھ سو چہتر رہ گئی۔ ۱۹۶۶ء میں اگرچہ فسادات کے واقعات کی تعداد ایک سو چوالیس تھی لیکن اپنی ہلاکت خیزی اور شدت کے اعتبار سے یہ واقعات بہت بڑے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں گڑ بڑ کے دو سو بیس واقعات ہوئے اور ان میں کشت و خون کے جہاں اور واقعات شامل ہیں وہیں رانچی کا وہ فساد بھی ہے جس کی خون آشامی نے ساری دنیا کو چونکا دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں مار دھاڑ کے تین سو چھیالیس واقعات ہوئے۔ میرٹھ، رانی گنج، اندور، کلکتہ، الہ آباد اور جبل پور میں ہونے والی قتل و غارت گری اسی سال کے دوران ہوئی۔ یہ سلسلہ جب ۱۹۶۹ء تک پہنچا تو اس کے واقعات کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ تاہم اس کے نو ماہ میں دو سو دس بار مسلمانوں کی خونریزی ہوئی۔ احمد آباد کی وہ خونریزی بھی اس میں شامل ہے جس میں بلا مبالغہ ہزارہا مسلمان ذبح کئے گئے۔

یہ تو تھی واقعات کی گنتی اور شماری۔ اب ذرا یہ بھی دیکھ لیجئے کہ کتنے بے گناہ انسان ان واقعات کی بھینٹ چڑھے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۲ء تک نو سال کے عرصے میں اہنسا پرستوں نے تین سو سولہ بے خطا انسانوں کی جان لی۔ صرف ۱۹۶۷ء میں تقریباً تین سو افراد فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گئے۔ ۱۹۶۸ء بھی اپنی خون آشامی کے لئے کچھ کم نہ تھا۔ اس کے پہلے چھ ماہ کے دوران ہی تقریباً تین سو بے گناہوں کا خون اہنسا پرستوں کے تعصب کی بھینٹ چڑھا۔ اگلے چھ ماہ کی داستان تو اور بھی درد انگیز اور خون سے رنگین ہے۔

(۷) محولہ بالا مقالہ میں اس قسم کے فسادات کی ابھی بہت سی تفاصیل باقی ہیں جن کے درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن احمد آباد کے فساد کی تفصیل اس قدر درد انگیز اور حیا سوز ہے کہ اسے سامنے لائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس میں لکھا ہے کہ

احمد آباد کا فساد "ہندوستان ٹائمز" کے نامہ نگار اجیت بھٹا چارجی کی ایک رپورٹ ۵ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی۔ اس میں اس نے لکھا ہے:-

شہر کی کچھ بستیاں اس طرح ہموار ہو گئیں جیسے بیک وقت آگ اور طوفان کی لپیٹ میں آ گئی ہوں۔ عید گاہ کی بستی میں ایک لمبے چوڑے تکونے علاقے میں جو کچھ بچا وہ یہ تھا: ایک دیوار کا کچھ حصہ سیاہ اور مڑی تڑی لوہے کی چادریں، کچھ کاٹھ کباڑ اور راکھ کے ڈھیر، ایک جگہ بجھنے ہوئے چنوں کا ڈھیر لگا تھا اور اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ قریب کے چند دکانداروں نے مجھے بتایا کہ وہاں چنے کی دکان تھی جو ایک مسلمان کی ملکیت تھی۔ کچھ شرپسندوں نے اسے آگ لگا دی اور جلد ہی شعلے لکڑی کے گوداموں تک پھیل گئے جو ہندوؤں کے تھے۔ اس وقت فساد عروج پر تھا۔ چنانچہ آگ بجھانے کی اپیل پر نہ تو پولیس نے کان دھرے اور نہ ہی فائر بریگیڈ نے کوئی عملی قدم اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا بلاک جل کر ختم ہو گیا۔

درمیانے درجے کے مکانوں کی ہر قطار جل کر تباہ ہو گئی۔ ہر مکان کے دروازے اور کھڑکیاں جل گئی تھیں بجلی کی اشیاء اکھیڑ لی گئی تھیں۔ ہر گھر کا فرنیچر اور سامان یا تو توڑ دیا گیا تھا یا جلا دیا گیا تھا۔ سڑک پر جلی ہوئی چیزوں کے ڈھیر میں ایک جلے ہوئے رکشا کا ڈھانچہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک رہبر تھا۔ اس نے فساد کے دوران بہت سے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ اس نے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہاں شرپسندوں

کے ہجوم نے ایک مسلمان کو زندہ جلا دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے کاندھے پر مجھے ایک نیلا نشان دکھایا جو لاٹھی کی ضرب لگنے سے پڑ گیا تھا۔ یہ چوٹ ایک مسلمان بچی کو فسادیوں کے ہاتھوں بچانے کا صلہ تھا۔"

فساد کے دوران کس قدر جانیں ہلاک ہوئیں، اس کے بارے میں اجیت بھٹا چارجی کا خیال ہے کہ اصل تعداد کا پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے، ان میں سے اکثر تو مر گئے اور کچھ لوگ بھاگ گئے۔ بہت سی لاشیں موقع پر جلا دی گئیں۔ ایک اور بڑا مسئلہ جو صوبائی حکومت کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ جن مسلمان خاندانوں کے کمانے والے فساد کی آگ کی نذر ہو چکے ہیں، انہیں اگر امداد دی جائے تو مرنے والوں کی تعداد اس طرح خود بخود متعین ہو جائے گی جب کہ حکومت کسی ناقابلِ تردید قانونی ثبوت کے بغیر ایسا نہیں چاہتی۔

تاہم مقامی حکام نے یہ تسلیم کیا کہ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ افراد فساد کے دوران جاں بحق ہوئے۔ بعد میں جب مرکزی حکومت کے وزیرِ داخلہ مسٹر چاون نے شہر کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ مرنے والوں کی تعداد ساڑھے تین سو سے لے کر چار سو تک ہوگی۔ لیکن اخبارات نے اس سے بھی بڑی تعداد کی خبریں شائع کیں۔ برطانیہ کے کچھ اخبارات نے لکھا کہ احمد آباد میں ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اس پر بھارتی اخبارات یہ تعداد ہزاروں میں بتانے لگے۔ حتیٰ کہ بھارت کے بائیں بازو کے ایک کثیر الاشاعت ہفت روزہ "بلٹز" نے اس رپورٹ کے کچھ حصے شائع کر دیئے جو بھارت کی قومی اتحاد کونسل کے ممبر پروفیسر سنتیما رائے نے وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کو ارسال کی تھی۔

اخبار مذکور نے پروفیسر رائے کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک محتاط اندازے کے مطابق مرنیوالوں کی تعداد چار ہزار لکھی ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں ہفت روزہ "بلٹز" نے لکھا:۔

"پروفیسر رائے کا کہنا ہے کہ صرف ہسپتالوں کی رپورٹوں ہی کے مطابق ۱۲ سے ۲۱ ستمبر تک دو ہزار اڑتالیس لاشیں سول ہسپتال لائی گئیں۔ اس تاریخ کے بعد لاشوں کو ڈھڈلیشوار کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ وہاں انہیں بڑے بڑے گڑھوں میں ڈال کر مٹی سے ڈھانپ دیا گیا۔ جائدادوں کے نقصان کے بارے میں مختلف اداروں کے اندازے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ گجراتی جریدے نے اس نقصان کا اندازہ پچیس کروڑ کا لگایا ہے لیکن پروفیسر رائے کے مطابق اصل نقصان پچاس کروڑ روپے سے بھی اوپر ہوا۔"

احمد آباد میں مسلمان مردوں اور عورتوں پر جو ہیبت ناک ظلم و تعدی ہوا، پروفیسر سنتیما رائے اس کے چند نمونے قلم بند کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کس قدر وحشی اور ذلیل ہو سکتا ہے۔ پروفیسر کی رپورٹ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"ایک زخمی عورت نے جسے ہسپتال میں داخل کیا گیا، بیان دیا کہ جمعہ کی رات قتل و غارت گری کی رات تھی۔ نو بجے سے بلوائیوں نے کئی کئی سو کے جتھوں میں اکٹھے ہو کر حملے شروع کر دیئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ فسادیوں نے سب سے پہلے ہمیں ہمارے گھروں سے باہر گھسیٹا۔ اس کے بعد ہمارے گھر کی تمام اشیاء کو جلا دیا گیا۔ ہمارے مردوں اور بچوں کی لاشوں کے ٹکڑے کئے گئے اور انہیں آگ میں ڈال دیا گیا۔

بلوائی شراب کے نشے میں تھے۔ انہوں نے ہم پہ مجرمانہ حملے کئے۔ کئی عورتوں کو قتل کر دیا۔ کچھ عورتوں کی تلواروں سے چھاتیاں کاٹ دیں۔ پھر وہ ہمیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہم سب کو ننگا کر دیا۔ کچھ غنڈوں نے ہماری شرمگاہوں پہ تیز دھار تلواریں چلائیں۔ ہم روئیں، چیخیں اور ان غنڈوں سے رحم کی بھیک مانگی اور کہا کہ ہمیں مار دو، ٹکڑے ٹکڑے کر دو، لیکن ہمیں بے عزت نہ کرو۔ لیکن ان پہ کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہمیں ایک خالی مکان میں لے گئے اور وہاں ہم پہ مجرمانہ حملے کئے۔ اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو خود کو ہسپتال (سول ہسپتال احمد آباد) میں پایا۔ یہاں مجھے یہ دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو مجھے ہسپتال سے نکال دیا جائیگا۔

ایک اور عورت نے بھی اسی قسم کا بیان دیا۔ اس کی داستان یوں ہے: ہمارے کچھ مرد تو بلوائیوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے اور کچھ بھاگنے پہ مجبور ہو گئے۔ تقریباً تین یا چار سو کے ایک گروہ نے مجھے پکڑ لیا۔ انہوں نے مجھے گھر سے باہر گھسیٹ کر ننگا کر دیا اور مجھ پہ مجرمانہ حملے کئے۔ صبح سے پہلے ان میں سے کسی نے میری چھاتیاں کاٹ دیں اور میرے ہاتھ پیر باندھ کر لٹا دیا۔ اس کے بعد میرے گال کاٹ دیئے۔ پھر ایک آدمی نے میری پیشاب گاہ پہ ایسڈ ڈال دی۔ میں روئی، چیخی، حتیٰ کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو میں سول ہسپتال میں تھی۔"

بھیونڈی میں

(۸) "بھیونڈی میں ۷ مئی کو فساد شروع ہوئے اور پھر یہ آگ دوسرے شہروں کیتھری، کولابہ، مہاد، ساتراں، جلگاؤں، کوبیاں، دیپاوالی، دیلر اور تھانہ تک پھیلتی چلی گئی۔ یہ تمام شہر بھیونڈی سے دو سو چالیس میل سے لے کر چار سو میل دور تک واقع ہیں۔ لیکن ان سب مقامات پہ فسادات کا بیک وقت شروع ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سکیم تھی اور اکثریتی فرقے کے لوگوں کا "وقتی اُبال" نہ تھا۔

بجلی کاٹ کر سارے شہر میں اندھیرا کر دینے کے بعد بھالوں، ... کاک ٹیل، پٹرول، آگ کے گولوں اور تیروں کا استعمال بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ ظلم کے ہاتھ اس قدر منظم اور ان کی جنبش کتنی ہم آہنگ تھی اور نمایاں بات یہ ہے کہ یہ خونی ڈرامے کرفیو کے اوقات کے دوران ہوئے جبکہ پولیس اور فوج کے دستے بھی گشت پہ ہوتے ہیں۔

کچھ سرکاری اور نیم سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جو اگرچہ درست نہیں ہوتے اموات کی علاقہ وار تفصیل یہ ہے: بھیونڈی میں نو سو اٹھ، جلگاؤں میں بیالیس اور تھانہ میں چار۔ ۱۲ مئی تک زخمی ہونے والوں کا سرکاری تخمینہ تین سو انتیس کا ہے۔

یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا کے مطابق دو کروڑ روپے کی جائداد تباہ ہوئی۔ تقریباً دو سو کرگھے، پچاس کانیں اور اتنے ہی مکان، ان کے علاوہ کئی کارخانے جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ بنارس کی ریشمی ساڑھیاں تیار کرنے کا ایک مرکز بھی تباہ ہو گیا۔"

نئی دہلی سے شائع ہونے والے جریدے "مین سٹریم" نے متاثرہ علاقوں کے سروے کے بعد ایک رپورٹ شائع کی جس میں یہ انکشاف ہوا کہ شہر کی ایک لاکھ چالیس ہزار کی آبادی میں سے تقریباً چالیس ہزار بے گھر ہوئے۔

چالیس ہزار برقی کھڈیوں میں سے آٹھ ہزار جلا دی گئیں جس سے کوئی دس ہزار افراد بے روزگار ہو گئے۔ تقریباً سوا سو افراد مارے گئے اور دو ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔

ایک المناک واقعہ یہ ہوا کہ جوشی پورہ میں شرپسندوں نے تئیس افراد پر مشتمل ایک برات کو مکان میں مقفل کر دیا اور اس کے بعد آگ لگا دی۔ سب کے سب جل کر بھسم ہو گئے۔

بھارت کی سپریم کورٹ کے ایک سینئر ایڈووکیٹ ایس۔ پی۔ سنہا نے ملک میں اقلیتوں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو "ریڈینس" کی ۲۱ جون ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں ایس۔ پی سنہا نے لکھا :-

"رانچی، جمشید پور، اندور، مئو، الٰہ آباد، میرٹھ، احمد آباد، جیپاسا اور جلگاؤں —— اس فہرست کی طوالت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان شہروں میں جو کچھ ہوا اس نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے۔ جان و مال کا نقصان بے اندازہ ہوا۔

پرانا طریقہ فسادی لوگ فساد برپا کرنے کے لئے ایک ہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ جن سنگھ کا کرائے کا آدمی ہندوؤں کے کسی جلوس پر کوئی چیز پھینک دیتا ہے اور اس کے فوراً بعد پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مسلمانوں پر حملہ کر دیا جاتا ہے۔ حملے کے دوران نہ بچوں کو معاف کیا جاتا ہے نہ بوڑھوں کو، اور نہ کمزوروں کو۔

اگر فساد کی ابتداء کرنے کے لئے کرائے کا کوئی ایجنٹ نہ ملے تو پھر بہانہ یہ بنا لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے مندر پر حملہ کیا تھا۔ احمد آباد میں ایک مسجد کو اس بہانے سے تباہ کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے جگن ناتھ مندر پر مبینہ طور پر حملہ کیا۔ حالانکہ وہ حملہ نہ تھا بلکہ یہ چند جوانوں کی شرارت تھی جسے رائی کا پہاڑ بنا کر حملہ قرار دے دیا گیا۔ اس "حملے" کے دوران مندر کے دروازے کے صرف شیشے ٹوٹے لیکن بعد میں مسلمانوں کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ بے شمار جانیں ہلاک ہوئیں اور ان کی جائیدادیں راکھ کا ڈھیر بنا دی گئیں"۔

یہ ہے مختصر سا جائزہ اس "سلوک" کا جو ہندوؤں کی طرف سے خود ان کی مملکت میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف روا رکھا جا رہا ہے۔ ان مسلمانوں کے خلاف جو وہاں کی مملکت کے باشندے اور انڈین نیشنلز ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم صرف ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کیا اس قسم کے مسلسل واقعات کی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں بھی ملتی ہے؟ اور قتل و غارت گری اور وحشت و بربریت کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ جس وقت یہ سطور (اپریل ۱۹۸۰ء میں) قلمبند کی جا رہی ہیں، برہان پور کے تازہ ترین فسادات کی دل دوز اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔

یہ واقعات ۱۹۷۰ء تک کے ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزری، ہمیں افسوس ہے کہ اس کی تفصیلات اور اعداد و شمار (سر دست) ہمارے پاس موجود نہیں۔ البتہ ان پر ۱۹۷۰ء میں کیا بیتی اس کے متعلق روزنامہ نوائے وقت (لاہور) نے اپنی اشاعت بابت ۲ اپریل ۱۹۸۰ء میں حسب ذیل رپورٹ شائع کی تھی :-

سیکولرازم کے دعویدار ملک بھارت میں یکم جنوری ۱۹۷۹ء سے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۹ء تک یعنی صرف ایک سال میں متعصب ہندوؤں نے بڑی فراخدلی سے اور بڑے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا شکار کیا، ان کے خون سے ہولی کھیلی۔ ان کے مال و منال کو برباد کیا اور ان کی عزّت آبرو پر ہاتھ ڈالا۔ بھارت کے وزیر مملکت برائے امورِ داخلہ یوگندر مکوانہ نے ۲۹۔ مارچ کو نئی دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا (راج سبھا) میں اعلان کیا کہ گزشتہ سال بھارت میں تین سو چار مرتبہ مسلم کش فسادات برپا ہوئے۔ یہ بات سن کر بعض متعصب ہندو دل میں تلملائے ہوں گے کہ سال کے دن تین سو پینسٹھ اور مسلم کش فسادات صرف تین سو چار آخر اکسٹھ دن ہندو کیوں اس نیکی سے محروم رہے اور اتنے دن مسلمان بھارت میں لٹنے پٹنے اور کٹنے مرنے سے کیوں بچے رہے؟

یوگندر مکوانہ نے جو تفصیل بیان کی ہے اس کی رُو سے گزشتہ برس آندھرا میں چوالیس مرتبہ، بہار میں ۴۳ مرتبہ، گجرات میں ۲۷ مرتبہ، مدھیہ پردیش میں ۲۴ مرتبہ، مہاراشٹر میں ۲۳ مرتبہ، مغربی بنگال میں ۲۲ مرتبہ، آسام میں ۲۰ مرتبہ، تامل ناڈو میں ۱۲ مرتبہ، مقبوضہ کشمیر میں ۱۱ مرتبہ، کرناٹک میں ۱۰ مرتبہ، راجستھان میں ۱۰ مرتبہ، اڑیسہ میں ۷ مرتبہ، کیرالہ میں ۷ مرتبہ، دہلی میں چھ مرتبہ۔ منی پور، مشرقی پنجاب، ہماچل، میگھالہ، سکم اور تری پورہ میں ایک ایک مرتبہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی لیکن مکوانہ نے بھارت کے اس سب سے بڑے صوبے کے اعداد و شمار پیش نہیں کئے جو بھارت کا سب سے بڑا صوبہ ہی نہیں مسلم تہذیب کا سب سے قدیم گہوارہ تھا یعنی یوپی کے بارے میں صرف اتنا کہا کہ وہاں سب سے زیادہ تعداد میں مسلم کشی ہوئی۔ اگر مکوانہ کے پیش کردہ مندرجہ بالا اعداد و شمار کو اکٹھا کیا جائے تو صوبہ یوپی کو چھوڑ کر باقی صوبوں میں ۲۷۳ دن مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی اور اگر مکوانہ کے قول کے مطابق یوپی میں سب سے زیادہ مرتبہ مسلمان تعصب کا شکار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان کی تعداد بہر حال آندھرا اور بہار کے اعداد سے زیادہ ہو گی اگر اسے ہم ساٹھ مرتبہ بھی شمار کریں تو مجموعہ تین سو چار کی جگہ تین سو تنتیس ہو جاتا ہے۔		(نوائے وقت۔ ۲۰ اپریل ۱۹۸۰ء)

۱۹۸۰ء میں کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا جس میں وہاں سے خونِ مسلم کی ارزانی کے ہولناک واقعات کی خبریں موصول نہ ہوئی ہوں۔ یہ واقعات وہ ہیں جو کسی نہ کسی طرح پبلک کے سامنے آ گئے ہیں۔ چند سال ادھر کی بات ہے، ہندوستان کے ایک ممتاز شہری مسٹر گابا نے انگریزی زبان میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا عنوان تھا "دبی ہوئی آہیں"۔ اس میں انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کے ان جانسوز حالات کا ذکر کیا تھا، جنہیں کسی کی زبان تک نہیں آنے دیا جاتا ۔۔۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہاں کے مسلمان مسلسل ایسی آگ میں جل رہے ہیں جس کا دھواں ابھرنے نہیں دیا جاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک ایک نسخہ ہمارے ان (حقیقت ناآشنا فریب خوردہ) نوجوانوں کے ہاتھ میں دینا چاہیئے جو اٹھتے بیٹھتے شکوہ سنج رہتے ہیں کہ ہم نے ہندوؤں سے الگ ہو کر بڑی حماقت کی! مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے یہ مظالم کسی ہنگامی یا وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہیں۔

نراد چودھری کا تبصرہ

ایک بنگالی نژاد ہندو ہے — NIRAD C. CHAUDHURI — عمر رسیدہ اور بڑا فاضل۔ اس نے ہندو ذہنیت کا مطالعہ ایسی گہرائی سے کیا ہے کہ باید و شاید۔ اور اسے پھر اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE CONTINENT OF CIRCE) میں بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔ وہ اس میں ہندو مسلم فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات کے سلسلہ میں جو اصل حقیقت ہے اور اسے جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے بڑا تضاد میں نے ساری عمر کہیں اور نہیں دیکھا۔ میں نے ہندو مسلم فسادات کے ضمن میں قتل و غارت گری، لوٹ، عصمت ریزی کے واقعات نہایت وسیع پیمانے پر دیکھے بھی ہیں اور ان کی روئداد بھی پڑھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بیانات بھی اپنی آنکھوں سے پڑھے ہیں کہ ایسے واقعات کے لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ہندو اور مسلمان تو نسلی اور ثقافتی اعتبار سے ایک ہیں (اور جو ایک ہوں ان میں عداوت اور تنافر کیسے ہو سکتا ہے) (ص۳۹)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذباتِ نفرت و عداوت کو چھوڑیئے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کے ساتھ جو برتاؤ ہے اس کا اندازہ رامائن کی اس حکایت سے لگایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

> ایک دن رام کو بتایا گیا کہ فلاں جگہ ایک برہمن کا اچانک انتقال ہو گیا ہے اور اس قسم کے ناگہانی واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں کہیں مہا پاپ (بہت بڑا گناہ کا کام) ہوا ہے۔ شری رامچندر جی مہاراج معاملہ کی تحقیق کے لئے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شودر، اپنی نجات کی بھگتی اس طریق سے کر رہا ہے جو اعلیٰ ذات کے آریوں کے لئے مختص ہے۔ اس پر اس شودر کا سر قلم کر دیا گیا۔ اور جونہی اس کا سر بدن سے جدا ہوا، وہ برہمن زندہ ہو گیا۔ اس پر دیوتاؤں نے رامچندر جی پر تبریک و تحسین کے پھول برسائے کہ انہوں نے اس ضرب کاری سے آریائی ثقافت کی حفاظت کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ (ص۱۲۷)

پاکستان کو ختم کرنے کی سازش

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوؤں نے، تقسیم ہند کا اصول تسلیم کرنے کے ساتھ ہی اعلان کر دیا تھا کہ ہم کسی نہ کسی طریق سے پاکستان کے جداگانہ وجود کو ختم کر کے اسے پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیں گے۔ اس سلسلہ میں کیا گیا، اسے بھی غور سے سنیئے:-

تقسیم کے معاہدہ کی رو سے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے (۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک) صرف (۴،۷۰۳) ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی سب خود ہڑپ کر گیا۔

ترکہ کی تقسیم

تقسیم کے وقت، چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمشکل اس پر رضامند ہوا کہ پاکستان کو (۵۵) کروڑ روپیہ دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ پاکستان کو پہلے مل چکا تھا۔ ہندوستان، بقایا ۵۵ کروڑ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس کے لئے پاکستان کو شور احتجاج کرنا پڑا اور جب بین الاقوامی دباؤ کے ماتحت ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے بھی پانچ کروڑ روپیہ ڈنڈی مار کر رکھ لیا جو آج تک نہیں دیا۔ (جس زمانے میں ہندوستان، پاکستان کے حصے کا روپیہ دبا کر بیٹھا ہوا تھا، ہندوستان کے حصہ کے نوتے جنگی ہوائی جہاز پاکستان میں پڑے تھے۔ پاکستان نے نوتے کے نوتے بحفاظت ان کے حوالے کر دیئے)۔

ہندو کی آتش انتقام اس سے فرو تھوڑے ہو سکتی تھی؛ وہ تو پاکستان کو سرے سے ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان جس حالت میں تھا، اور ہندوستان اسے کمزور سے کمزور تر کرنے کے لئے جو کچھ کر رہا تھا، اسے پیش نظر رکھئے، اور اس کے بعد وہاں کے سابق چیف

جنگ کی تیاریاں

جسٹس مسٹر مہاجن کا یہ انکشاف ملاحظہ فرمائیے کہ ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیش نظر اس فیصلہ پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ جب ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات کرائے گئے تو اس کے ساتھ ہی وہاں پاکستان پر فوجی حملہ کرنے کی ایک تحریک چلائی گئی جس کی تائید وہاں کے بڑے بڑے لیڈروں ——— مثل پنڈت نہرو، سجے پرکاش نرائن۔ آر۔ کے چودھری وغیرہ نے کی۔ وزیر اعظم پاکستان ——— نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن پنڈت نہرو نے اس پیشکش کو نہایت بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا۔ ابتدائے ۱۹۶۵ء میں، ہندوستان نے "رن آف کچھ" میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہاں کے ہوم منسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے پوری آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ہے۔ اور وزیر اعظم نے یہ کہہ کر اس کی تائید کی کہ آج ہندوستان کی پینتالیس کروڑ آبادی ہر قربانی کے لئے تیار کھڑی ہے۔ ادھر رن آف کچھ کے علاقے میں یہ ہو رہا تھا، اور ادھر، بنگال میں انہوں نے پاکستانی علاقہ، داہگرام پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا ——— اور پھر، ستمبر ۱۹۶۵ء میں جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ واقعہ تو ہماری موجودہ نسل کی آنکھوں کے سامنے ظہور میں آیا تھا۔

میں نے اس سلسلہ میں مسئلہ کشمیر کا ذکر قصداً نہیں چھیڑا کیونکہ وہ ہندو ذہنیت کی فی ذاتہٖ مکمل تصویر ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ لیکن میں اس ضمن میں، کم از کم ایک مثال ضرور پیش کروں گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندو کس قدر کمینہ فطرت واقع ہوا ہے۔ کوئی دو سال ادھر کا ذکر ہے (یعنی ۱۹۷۶ء کا) کہ جمعیت العلماء ہند کے ناظم عمومی، (اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے صاحبزادہ مولانا سید اسعد مدنی نے اپنا ایک خط اخبارات میں شائع کیا تھا جو انہوں نے کسی وقت لال بہادر شاستری کو لکھا تھا۔

لہ نہ ہی حیدرآباد، جونا گڑھ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

اس خط میں انہوں نے مسٹر سنگھ سے کہا تھا :-

میں نے اخبارات میں شائع شدہ آپ کی ایک تقریر پڑھی جس میں آپ نے این. سی. سی کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پاکستان، جو ہمیشہ اسلام کی اصطلاح میں سوچتا ہے، اس دعوے میں ہے کہ وہ کشمیر کو اس لئے ہڑپ کر لے گا کہ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے - یہ پاکستان کی خام خیالی ہے - ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں - اگر پاکستان یہ سوچتا ہے کہ وہ مسلم اکثریت کے بل پر کشمیر کو لے سکتا ہے تو اسے اچھی طرح سوچ رکھنا چاہیئے کہ اس صورت میں ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا۔

(ماہنامہ "تذکرہ"۔ دیوبند۔ بابت دسمبر ۱۹۶۵ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام جون ۱۹۶۶ء)

آپ سوچئے، کہ کیا دنیا میں دنائت اور بدنہادی کی اس سے بدتر مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ یعنی اگر پاکستان نے کشمیر کے مسئلہ کو اٹھایا تو ہندو، ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ختم کر دے گا! یا للعجب!

جنگ کے بعد

۱۹۶۵ء کی جنگ میں استخواں شکن شکست کھانے کے بعد، ہندو نے اپنا پینترا بدلا، اور جو مقصد کھلے میدان میں جنگ کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اُسے زیرِ زمین دوز سازش کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس زیرِ زمین دوز سازش کی تفصیلات میں گئے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ یہ ۱۹۷۱ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کے سقوط اور علیحدگی کی شکل میں دُنیا کے سامنے آئی۔ ہم اس جنگ کی تفاصیل میں بھی نہیں جانا چاہتے۔ بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس "فتح" کے بعد ہندو زعما کے وہ جذبات جنہیں وہ اتنے عرصہ تک منافقت کے پردے میں چھپائے چلے آ رہے تھے کس طرح ابھر کر سامنے آ گئے۔ مسز اندرا گاندھی نے نومبر ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا :-

میرے پتا، پنڈت نہرو تحریکِ آزادی کے ایک عظیم رہنما تھے۔

وہ میرے سب کچھ تھے۔ وہ میرے شفیق باپ بھی تھے، استاد بھی اور راہنما بھی۔ یہ سب اپنی جگہ درست ہے لیکن بھارت کی تاریخ ان کے اور ان کی جماعت، انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بھیانک جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ جرم ہے بھارت کی تقسیم۔ انہوں نے مسلم لیگ، ماؤنٹ بیٹن، پٹیل اور ہندو مہا سبھا کے دباؤ میں آ کر ایک ایسا فیصلہ قبول کر لیا جس نے بھارت ماتا کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بات مجھے بڑے دُکھ سے کہنی پڑ رہی ہے، اس لئے کہ وہ میرے پتا تھے۔ لیکن اس سے زیادہ وہ بھارت کے ہر دلعزیز رہنما بھی تھے۔ آج مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے تو میں اُن کی بیٹی سے زیادہ، بھارت کی وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی بات کر رہی ہوں۔ میں یہ بات نہیں بھول. تو بھارت کی موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں ہمیشہ کہتی رہیں گی۔ وہ پنڈت نہرو اور انڈین نیشنل کانگریس کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

(بحوالہ مشرق۔ ۱۸ اپریل ۱۹۷۲ء)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے اس کے جواب میں کیا کہا تھا؟ اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مارا ہے۔ اُس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہم نے ایک ملک فتح کر لیا ہے۔ اُس نے کہا یہ تھا کہ

> یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اُس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ اُن کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور اُن کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی اس کشمکش کی بنیاد نہ سیاسی ہے نہ معاشی۔ یہ خالصتاً نظریاتی ہے اور ہندوؤں نے (سابق) مشرقی پاکستان میں اپنے مسلسل پروپیگنڈہ کے ذریعے وہاں کے مسلمانوں کو نظریاتی طور پر اپنے ہمنوا کر لیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب مسز اندرا گاندھی وہ کچھ کہہ رہی تھیں تو دوسری طرف اس زمانے میں بنگلہ دیش کے قائم مقام صدر مسٹر نذر الاسلام یہ فرما رہے تھے۔

> ہماری یہ فتح، کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے، سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا، جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت، تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہ کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلائے، جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

خود مجیب الرحمٰن نے پاکستان سے رہا ہونے کے بعد ڈھاکہ پہنچنے پر کہا کہ

> میری قوم سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے نظریات کی حامی ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ میری پالیسی اور اندرا گاندھی کی پالیسی میں اس قدر توافق کیوں ہے اس کا جواب صاف اور

واضح ہے کہ ہم دونوں کے نصب العین، زاویۂ نگاہ، اور اقدارِ حیات ایک ہیں۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۷۲ء)

ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار (FORUM) نے اپنی ۳ر جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہلِ پاکستان میں وجۂ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس ملمع کی قلعی کھول دی اور نظریہ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوشنمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور استحصال پسند طبقہ اس شدومد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئی ہیں۔

اس کے بعد اس نے اپنی ۲۷ر فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچئے کہ بلوچ، پٹھان اور پنجابیوں کو کون سا رشتہ متحد رکھ سکے گا۔ اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکے گی۔

اس قسم کے مسلسل پراپیگنڈہ نے (سابق) مشرقی پاکستان کے نوجوانوں کے دل میں پاکستان ہی نہیں بلکہ خود اسلام کے خلاف کس شدت سے زہر بھر دیا تھا اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگائیے جسے اس نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:۔

مشرقی پاکستان کی بے باکیاں

ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالدؓ۔ طارقؒ۔ موسےٰؑ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا —— اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ

مشرقی بنگال کی اس روش کے تتبع میں، مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

سندھ میں اس کا کیا ردِعمل ہوا اس کے متعلق، ایک سندھی طالبہ، مس نسیم تھل کا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جو کراچی کے روزنامہ حریت کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۴ر نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:۔

وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہن جو داڑو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز، جی۔ ایم۔ سید کی طرح کے شاعروں، دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔

اور سندھ ہی کی ایک اور بیٹی عزرا بلوچ نے اپنے خط میں جو کراچی کے اخبار ڈیلی نیوز کی ۲۰ اگست ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، لکھا تھا:-

> بہاریوں کی بدقسمتی در اصل اُس دن سے شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں میں جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں بسنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پسند قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں۔

اور کم و بیش انہی الفاظ کی صدائے بازگشت ہے جو ہم آج کل ۱۹۸۰ء میں، ان نوجوانوں کی زبان سے سن رہے ہیں جن کے حوالے سے اس مقالہ کا آغاز کیا گیا ہے۔

اور سچ پوچھئے تو اس میں ان نوجوانوں کا اتنا قصور نہیں جتنا قصور ہمارا ہے۔ اس کے مجرم ہم ہیں جنہوں نے،

(۱) نوجوانوں کی اس نسل کو بتایا ہی نہیں کہ ہم نے ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔

(۲) ہم نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ نظریہ پاکستان کیا ہے اور یہ کس طرح مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرار پاتا ہے۔

(۳) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہم نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ ہندو کی ذہنیت کیا ہے اور وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ اور اگر ہم وہاں رہتے تو ہمارا حشر کیا ہوتا۔

(۴) انہیں یہ بتایا نہیں کہ اور یہاں وہ نظام قائم نہیں کیا جس کے متعلق ہم تیس سال سے مسلسل کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس نظام کا قیام، ہندوستان سے ہماری علیحدگی کا حقیقی مقصد تھا۔ اس نظام کا قیام تو ایک طرف ہم نے تو انہیں یہ تک بھی نہیں بتایا کہ وہ نظام ہے کیا اور وہ کس طرح اس نظام سے مختلف ہے جو ہندوستان (یا دنیا کے کسی اور ملک) میں رائج ہے؛ اور اس کی منفرد خصوصیات اور خوشگوار نتائج کیا ہوں گے۔ اگر وہ نظام یہاں قائم ہو جاتا تو اس قسم کے کوئی شکوک و شبہات پیدا ہی نہ ہوتے جو اس وقت ہماری نئی نسل کے قلب و دماغ کے لئے وجۂ صد اضطراب بن رہے ہیں۔ وہ نظام قائم ہو جاتا تو یہاں کے نوجوانوں کا مطمئن اور شکر گزار ہونا تو ایک طرف، دنیا بھر کے نوجوان کشاں کشاں اس کی طرف لپک کر آتے۔

یہ تھا اس نہایت اہم مسئلہ کا حقیقی حل جس سے ہم اس قدر تغافل برت رہے ہیں۔ بایں ہمہ، میں نے جو حقائق اور واقعات گزشتہ صفحات میں پیش کئے ہیں، مجھے امید ہے کہ جو نوجوان بھی ان پر سنجیدگی سے غور کرے گا، وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ پاکستان جیسا کچھ بھی ہے، اس کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنا بہر حال ہندو جیسے دشمنِ انسانیت کی محکومیت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس لئے اس خطۂ زمین کا محفوظ و مستحکم رہنا از بس ضروری۔ اس مملکت کا حصول، بانیانِ پاکستان کا ہم پر احسانِ عظیم ہے۔ خدا انہیں اس کا اجرِ جلیل عطا فرمائے اور اس خطۂ زمین کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھے۔

والسلام

ادارہ طلوعِ اسلام نے باہتمام شیخ نیاز احمد۔ علمی پرنٹنگ پریس، ۱۰ ہسپتال روڈ لاہور سے چھپوا کر گلبرگ ۲ سے شائع کیا۔